سورہ یوسف میں معاشرتی مسائل اور ان کے اثرات

(منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ)

Submitted By

TAHIR SHAH

01-259232-011

Supervised by

Dr RAHIM ULLAH

Assistant Professor BUIC

Department of Islamic Studies

School of Humanities and Social Sciences

BAHRIA UNIVERSITY ISLAMABAD E-8 CAMPUS

2023-2025

سورہ یوسف میں معاشرتی مسائل اور ان کے اثرات

(منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ)

Submitted By

TAHIR SHAH

01-259232-011

Supervised by

Dr RAHIM ULLAH

Assistant Professor BUIC

A Thesis Submitted in the Fulfilment of the Requirement for the Award of the Degree of Master of Science (Islam and Life)

Department of Islamic Studies

School of Humanities and Social Sciences

BAHRIA UNIVERSITY ISLAMABAD E-8 CAMPUS

Bahria University

Discovering Knowledge

SUPERVISOR'S STATEMENT

This is certified that the work contained in this thesis, entitled

"سورہ یوسف میں معاشرتی مسائل اور ان کے اثرات (منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ)" has been carried out under my supervision by TAHIR SHAH and is approved for submission in partial fulfilment of the requirement for the degree of MS Islamic Studies.

_____

Dr. Rahim Ullah

Assitant Professor

Bahria University Islamabad.

Bahria University

Discovering Knowledge

MS-13

THESIS COMPLETION CERTIFICATE

Student's Name: TAHIR SHAH

Enrollment No. 01-259232-011

Program of Study: MS Islamic Studies

Thesis Title:"سورہ یوسف میں معاشرتی مسائل اور ان کے اثرات (منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ)"

It is to certify that the above student's thesis has been completed to my satisfaction and that, to my belief, its standard is appropriate for submission for evaluation. I have also conducted a plagiarism test on this thesis using the HEC-prescribed software and found a similarity index of 12%, which is within the permissible limit set by the HEC for the MS/MPhil degree thesis. I have also found the thesis in a format recognised by the BU for the MS/MPhil thesis.

Principal Supervisor's Signature

_____

Dr. Rahim Ullah

Date:

Bahria University

Discovering Knowledge

MS-14A

AUTHOR'S DECLARATION

I, TAHIR SHAH, hereby state that my MS thesis titled,

"سورہ یوسف میں معاشرتی مسائل اور ان کے اثرات (منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ)" is my own work and has not been submitted previously by me for taking any degree from this University (Bahria University) or anywhere else in the country or world. At any time, if my statement is found to be incorrect, even after my graduation, the university has the right to withdraw or cancel my MS degree.

Scholar's Signature

_____

Name: TAHIR SHAH

Date

Bahria University

Discovering Knowledge

MS-14B

PLAGIARISM UNDERTAKING

I, TAHIR SHAH, solemnly declare that the research work presented in the thesis titled "سورہ یوسف میں معاشرتی مسائل اور ان کے اثرات (منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ)" is solely my research work with no significant contribution from any other person. Any small contribution or help, wherever taken, has been duly acknowledged, and the complete thesis has been written by me. I understand the zero-tolerance policy of the HEC and Bahria University towards plagiarism. Therefore, as the author of the above-titled thesis, I declare that no portion of my thesis has been plagiarised and that any material used as a reference is properly referred to and cited.

I undertake that if I am found guilty of any formal plagiarism in the above-titled thesis, even after the award of my MS degree, the university reserves the right to withdraw or revoke my MS degree. HEC and the university have the right to publish my name on the HEC/University website, where the names of students who submitted plagiarised theses are placed.

Scholar's Signature

_____

Name: TAHIR SHAH

Date:

ACKNOWLEDGMENT

In the name of Allah, the most gracious, the most merciful, and peace upon the Holy Prophet Muḥammad ﷺ, I am grateful to Almighty Allah, whose guidance enabled me to accomplish this work. I am deeply thankful to my supervisor, Dr. Rahim Ullah, for his guidance and valuable insights throughout this research project. I acknowledge that his support made this dissertation much more manageable for me. May Allah reward him for this noble act and bless him with a long, healthy life .I am grateful to my parents, teachers, and fellows, who have supported me throughout my educational journey. I also sincerely thank all my friends who assisted and guided me in completing this dissertation and the staff at Bahria University Islamabad, who provided support and guidance when needed.

DEDICATION

I dedicate this work to the beloved Prophet Muḥammad ﷺ. His wisdom enlightens the hearts to contribute positively to the world. May this work serve as a small tribute to his legacy, contribute to a deeper understanding of his noble mission, and remind us of his profound impact on our lives.

سورہ یوسف میں معاشرتی مسائل اور ان کے اثرات

(منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ)

Submitted By

TAHIR SHAH

01-259232-011

Supervised by

Dr RAHIM ULLAH

Assistant Professor BUIC

Department of Islamic Studies

School of Humanities and Social Sciences

BAHRIA UNIVERSITY ISLAMABAD E-8 CAMPUS

2023-2025

فہرست

باب اول 3

تفاسیر ،مؤلفین اور معاشرتی مسائل کا تعارف 3

فصل اول: تعارف تحقیق 3

موضوع تحقیق کا تعارف 3

موضوع سے متعلق سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ 4

فصل دوم: معاشرے کا معنی و مفہوم، ضرورت وارتقاء 9

معاشرہ کی تعریف 9

معاشرہ کی ضرورت 9

فصل سوم: منتخب تفاسیر کے مؤلفین کا تعارف 16

معارف القرآن کے مؤلف کا تعارف 16

ضیاء القرآن کے مؤلف کا تعارف 20

تبیان القرآن کے مؤلف کا تعارف 25

فصل چہارم: منتخب تفاسیر کا تعارف 28

معارف القرآن کا تعارف 28

ضیاء القرآن کا تعارف 34

تبیان القرآن کا تعارف 38

باب دوم 43

تعلق باللہ اور تعبیر رؤیا منتخب تفاسیر کی روشنی میں 43

فصل اول: تعلق باللہ اور معاشرتی مسائل 43

صبر منتخب تفاسیر کی روشنی میں 43

علم منتخب تفاسیر کی روشنی میں 57

توکل منتخب تفاسیر کی روشنی میں 66

رجوع الی اللہ منتخب تفاسیر کی روشنی میں 74

فصل دوم تعبیر رؤیا اور معاشرتی مسائل 82

یوسفؑ کا خواب منتخب تفاسیر کی روشنی میں 85
بادشاہ کا خواب منتخب تفاسیر کی روشنی میں 96
باب سوم 107
انفرادی، اجتماعی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کے اثرات 106
فصل اول: انفرادی، معاشرتی، اخلاقی مسائل اور کے اثرات 107
فصل دوم: اجتماعی معاشرتی اخلاقی مسائل اور ان کے اثرات 127
اجتماعی مسائل: 127
معاشرتی مسائل 132
اخلاقی مسائل 137
نتائج البحث 147
سفارشات 148
مصادر و مراجع 151

باب اول

تفاسیر، مؤلفین اور معاشرتی مسائل کا تعارف

فصل اول: تعارف تحقیق

موضوع تحقیق کا تعارف

سورہ یوسف قرآن مجید کی مشہور سورتوں میں سے ایک سورت ہے۔ یہ سورہ ایک ایسی مبارک ہستی کے نام سے موسوم ہے جس شخصیت کو اللہ تعالی نے قرآن مجید میں بڑی معتبر، پاکباز، پارسا اور انتہائی عزت مآب ہستی کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ اس ذات کی زندگی کے اکثر و بیشتر حالات کا اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیات میں ذکر فرمایا اور اس کے بچپن، لڑکپن، جوانی اور شباب کے ایام کو قرآن کی زینت بنایا ہے اور اسی ہستی کے نام پر اس سورت کا نام "سورہ یوسف" رکھا گیا ہے۔

معاشرہ کا مطلب افراد کا ایک ایسا اجتماع ہے جس کے پیش نظر کوئی مشترکہ فائدہ ہو اور افراد کا یہ اجتماع اس طور پر ہو کہ مل جل کر منظم انداز سے زندگی بسر کرے اور مقاصد کے حصول کے رسم ورواج اور قانون کی پابندی کرتے ہوئے چند ادارے بھی قائم کرے۔

زیر نظر تحقیق میں سورہ یوسف میں مذکور معاشرتی مسائل پر بحث کی گئی ہے اور منتخب تفاسیر کی روشنی میں ان سے متعلق مفسرین کے آراء بھی ذکر کی گئی ہیں۔ معاشرتی مسائل میں سے بالخصوص اخلاقیات، معاملات کا منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

منتخب تفاسیر میں مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر معارف القرآن، پیر کرم شاہ الازہریؒ کی تفسیر تفسیر ضیاء القرآن اور علامہ غلام رسول سعیدیؒ کی تفسیر تبیان القرآن شامل ہیں۔

تحقیقی خلاء

سورہ یوسف پر مختلف جہتوں سے کام ہوا ہے مثلاً نفسیاتی، تربیتی پہلو اور سورہ یوسف کا ترجمہ و تخریج اور اسکا تفسیری مطالعہ ہے، البتہ اس میں مذکورہ معاشرتی مسائل پر منتخب تفاسیر کی روشنی میں میری معلومات کے مطابق تحقیقی کام نہیں ہوا جس کو اس مقالے میں ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بیان مسئلہ

موضوع تحقیق کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وقت اور حالات کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں میں بگاڑ کی مختلف صورتیں پیدا ہو چکی ہیں جس سے انسانی حقوق ہر مرحلے پر متاثر ہو رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سورہ کا منتخب تفاسیر کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ ہو سکے۔

مقاصد تحقیق

موضوع تحقیق کے مقاصد درج ذیل ہوں گے۔

۱۔ سورہ یوسف میں مذکور معاشرتی مسائل کی تفہیم حاصل کرنا۔

۲۔ خواب کی تعبیر / تعبیر رویا کے ذریعے معاشرتی مسائل کو حل کرنے کا طریقہ سورہ یوسف کی روشنی میں معلوم کرنا۔

۳۔ سورہ یوسف میں تعلق باللہ سے متعلقہ مضامین کی توضیح کرنا۔

۴۔ سورہ یوسف کی روشنی میں انفرادی و اجتماعی سطح پر اخلاقیات کی اصلاح کے طریقہ کی تعین۔

۵۔ سورہ یوسف میں مذکورہ اخلاقی تعلیمات کی تعین۔

۶۔ سورہ یوسف میں مذکورہ معاشرتی مسائل کا سماج پر اثرات ذکر کرنا۔

سوالات تحقیق

موضوع تحقیق کے سولات درج ذیل ہیں۔

۱۔ سورہ یوسف میں تعلق باللہ سے متعلقہ مضامین منتخب تفاسیر کی روشنی میں تعین کیا ہے؟

۲۔ خواب کی تعبیر کے ذریعے معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے سورہ یوسف کی تعلیمات کیا ہیں؟

۳۔ انفرادی، اجتماعی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کون کون سے ہیں اور ان کے اثرات کیا ہیں؟

موضوع کی ضرورت اور اہمیت

قرآن کریم کے سورہ یوسف میں مذکورہ معاشرتی مسائل کا آج کے معاشرے کے مسائل کے تجزیاتی مطالعہ کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے اسلئے کہ ان معاشرتی مسائل کے اثرات کا صحیح ادراک تب ہی ممکن ہے کہ جب ہم آج کے معاشرتی مسائل کی عکاسی قرآن کریم میں مذکورہ مسائل اور اس کے نتائج میں دیکھ لیں۔

سورہ یوسف کی اہمیت کا اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جناب رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قبول اسلام سے قبل میں حج بیت اللہ کے ارادہ سے مکہ مکرمہ گیا۔ آپؓ نے مذہب کے مطابق مناسک حج ادا کئے۔ اسی دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوگئی آپ سے نصیحت کی باتیں سن کر دل کے ہاتھوں اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوگیا۔ لوگوں نے مجھے دیوانہ کہا۔ مگر میں نے ان کی باتوں کا کوئی اثر قبول نہ کیا اور کلمہ پڑھ کر سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت کرکے مسلمان ہوگیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول اسلام کے بعد سب سے پہلے مجھے "سورہ یوسف" یاد کرنے کا حکم دیا۔[1] سورہ یوسف کی کتنی عظمت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کو نماز کا حکم بعد میں دیا۔ صدقات وزکوۃ کا حکم بعد میں دیا۔ احکام دین بعد میں سکھائے مگر کلمہ پڑھنے کے بعد سب سے پہلا حکم دیا، تو سورہ یوسف کو یاد کرنے کا حکم دیا۔

موضوع سے متعلق سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ

اس سورہ میں مختلف پہلوؤں پر کافی کام ہوا ہے جس کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:

عربی مقالہ جات

1. **الجوانب التربوية في قصة يوسف عليه السلام (دراسة موضوعية) الطالب فرتون عبد الله جيدی۔ مرحلة ماجستير۔** اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد ۲۰۱۲۔ اس مقالہ میں تربیت کے حوالے سے قرآنی آیات کو جمع کیا گیا ہے، جن کا ترجمہ و تفسیر کیا اور تربیت کے مسائل کو ذکر کیا لیکن معاشرتی مسائل پر منتخب تفاسیر کی روشنی میں کام نہیں ہوا ہے۔

[1] نظام الدین نشاپوری، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۱، ص ۱۷۰ جلد ۱۳

2. **الجوانب الدعوية في سورة یوسف علیه السلام۔ الطالبہ سعدیہ اشرف ۔ مرحلۃ ماجستیر ۔ 2012۔ اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد**

اس میں صرف دعوتی مباحث ہیں باقی کچھ نہیں ہے اور میرا موضوع تحقیق معاشرتی مسائل منتخب تفاسیر کی روشنی میں ہے۔ یہ مسائل اس مقالہ میں نہیں ہیں۔

3. **قصۃ یوسف فی القران: دراسۃ محاسنھا الفنیۃ ،ایم فل مقالہ، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد**

اس مقالے میں فنی محاسن پر بحث ہوئی ہے، باقی نہیں۔ یعنی معاشرتی مسائل کے متعلق اس میں ذکر نہیں ہے جو کہ میرا موضوع تحقیق ہے۔

4. **الدخیل فی تفسیر مراح لبید لکشف معنی قرآن المجید(من اول سورہ یونس الی آخر سورہ القصص) الطالب: احسان الرحمٰن۔ مرحلۃ ماجستیر۔ الجامعۃ الاسلامیہ العالمیہ باسلام آباد: سیشن:2015۔ یہ مقالہ موضوعی روایات پر مشتمل ہے۔ محقق نے تفسیر کے موضوعی روآیات پر رد کیا ہے اور اس کی نشاندہی کی ہے۔ معاشرتی مسائل کے متعلق تحقیق نہیں کی گئی جو کہ مذکورہ تحقیق سے تعلق رکھتا ہے۔**

5. **مکونات الذکاء العاطفی فی ضوء سورہ یوسف دراسۃ موضوعیۃ، ایم فل مقالہ، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد۔**

دیگر اردو مقالہ جات

1. الجمال والکمال تفسیر سورہ یوسف کا تعارفی جائزہ BA HONOURS مقالہ نگار انعم احمد جی سی یونیورسٹی لاہور سن 2010

اس مقالے میں سورہ یوسف کا تعارفی جائزہ کیا گیا ہے، لیکن اس میں معاشرتی مسائل کا ذکر نہیں ہے۔

2. سورہ یوسف، سورہ الرعد، ابراھیم اور سورہ حجر کی پہلی آیات ،ایم فل مقالہ، عبدالولی خان یونیورسٹی ۲۰۱۴

3. معاشرتی مسائل میں مفتی تقی امینی کے افکار کا خصوصی جائزہ، تحقیقی مقالہ برائے بی۔ایس، علوم اسلامیہ، مقالہ نگار: آنسہ نور ،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، سیشن 2024-2020ء

4. اصلاح معاشرہ میں عورت کا کردار، تحقیقی مقالہ ایم اے علوم اسلامیہ، مقالہ نگار: میمونہ صولت ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، سیشن اگست 2006 تا جون 2008ء

اس مقالے میں معاشرہ میں عورت کے کردار کا ذکر ہے لیکن اس میں منتخب تفاسیر کی روشنی میں معاشرتی مسائل کا ذکر نہیں ہے۔

آرٹیکل

1) حضرت محمد ﷺ کے معاشرتی اور ان کے نفسیاتی اثرات، برجس: جلد ۵، شمارہ ۲ جولائی–دسمبر ۲۰۱۸

اس آرٹیکل میں معاشرے کے اصول وضوابط کو ذکر کیا گیا کہ معاشرے میں رویّے انسانوں کے کیسے ہیں۔

2) عصر حاضر میں دعوت کے لیے نمونہ عمل حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ کی روشنی میں۔ ڈاکٹر فریدہ یوسف اور ڈاکٹر نسیم اختر، ضیائے تحقیق، جی سی یو فیصل آباد، شمارہ 20۔

3) علم و حکمت بحیثیت اہلیت منصب: قصہ یوسف علیہ السلام سے استدلال۔ طاہرہ یاسمین۔ القم جون 2019۔

تصوراتی خاکہ

سورہ یوسف کے معاشرتی مسائل کا جائزہ لینا کہ اس سورہ میں کن مسائل کو ذکر کیا ہے اور آج یہ مسائل اس معاشرے میں بھی ہیں اور معاشرہ پر اس کے کیا اثرات ہیں۔

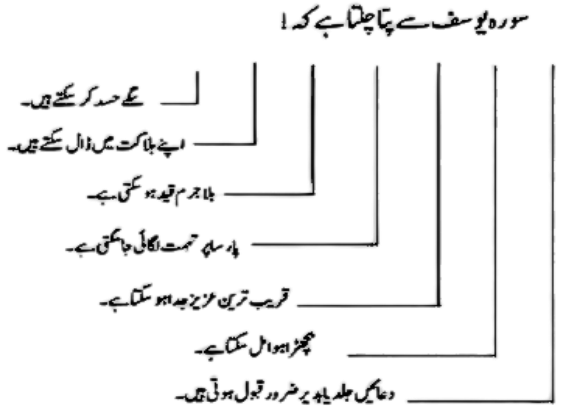

منہج تحقیق

تحقیقی حکمت عملی اور نقطہ نظر

موضوع تحقیق کی نوعیت کے پیش نظر تحقیقی طریقہ کار کے سلسلے میں درج ذیل امور کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۱۔ چونکہ اس مقالے میں منتخب تفاسیر کی روشنی میں سورہ یوسف میں معاشرتی مسائل اخلاقیات کا تجزیاتی مطالعہ کرنا مقصود ہے لہٰذا اس مقالے کا منہج تحقیق تجزیاتی ہو گا۔ اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ پہلے معاشرتی مسائل کا منتخب تفاسیر کی روشنی میں ذکر کیا جائے گا اور پھر اس کے اثرات کا ذکر ہو گا۔ تین مفسرین کی آرا کا تجزیہ کرتے ہوئے اسی کے ایجابی و سلبی پہلو واضح کیئے گئے ہیں۔

۲۔ فراہم شدہ مواد کی جانچ کیلئے لائبریزی کی طرف رجوع کیا گیا۔ مختلف کتب اور آرٹیکلز سے جمع شدہ معلومات کا تحقیقی مطالعہ کر کے آخر میں نتائج تحقیق مرتب کیئے گئے۔

۳۔ تحقیقی مقالہ کا متن ابواب اور فصول میں تقسیم کیئے گئے۔

۴۔ غیر ضروری طوالت و تکرار سے پرہیز کیا گیا ہے۔

۵۔ مقالہ کے آخر میں نتائج و سفاشات کو تحریر کیا گیا جو کہ منتخب تفاسیر سے ہیں۔

ڈیٹا کلیکشن اور تجزیہ

معلومات اور استدلات کی ترتیب و تدوین میں بنیادی مصادر اور مراجع کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ البتہ بوقت ضرورت ثانوی مصادر سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ نیز جو اصطلاحات استعمال ہوں گی حاشیے میں ان کی وضاحت کے لئے دیگر مختلف ویب سائٹس سے مدد لی گئے ہے۔

تحقیقی اخلاقیات

۱۔مقالے میں مذکور شخصیات کا مکمل احترام ملحوظ رکھا گیاہے۔

۲۔مقالے میں آداب رائے کے اصولوں کو ملحوظ رکھا گیاہے۔

۳۔مقالے میں دیانتداری کے ساتھ آراء کا تجزیہ کیا گیاہے۔

۴۔عبارت نقل کرنے میں ہر عبارت کا حوالہ دیا گیاہے۔

۵۔عربی اور انگلش کے اقتباسات نقل کرنے کے ساتھ ترجمہ کا اہتمام بھی کیا گیاہے۔

۶۔مقالے میں غیر سنجیدہ اور ناشائستہ زبان وبیان سے مکمل اجتناب کیا گیاہے۔

تحقیق کا دائرہ کار

1۔ تحقیق کو متعین کرنے اور طوالت سے بچانے کے لیے صرف سورہ یوسف کے معاشرتی مسائل کا انتخاب کیا گیاہے۔

2۔ یہ تحقیق منتخب تفاسیر معارف القرآن، ضیاء القرآن اور تبیان القرآن تک محدود ہے۔

3۔ اس سورہ کے معاشرے پر اثرات کا جائزہ لیا گیاہے۔

حوالہ جات وکتابیات

اس تحقیق میں سورہ یوسف کو معارف القرآن وضیاء القرآن اور تبیان القرآن کی روشنی میں دیکھا گیاہے۔

مقالہ ہذا میں حوالہ جات اور کتابیات کے لیے بحریہ یونیورسٹی کے طے کردہ فارمیٹ کو استعمال کیا گیاہے۔

ابواب وفصول

زیر بحث موضوع پر تحقیقی مقالہ درج ذیل ابواب اور فصول پر مشتمل ہے۔

باب اول: تفاسیر، مؤلفین اور معاشرتی مسائل کا تعارف

فصل اول۔ تعارف تحقیق

فصل دوم۔ معاشرے کا معنی و مفہوم، ضرورت و ارتقاء۔

فصل سوم۔ منتخب تفاسیر کے مؤلفین کا تعارف۔

فصل چہارم۔ منتخب تفاسیر کا تعارف۔

باب دوم: تعلق باللہ اور تعبیر رؤیا منتخب تفاسیر کی روشنی میں

فصل اول۔ تعلق باللہ اور معاشرتی مسائل

فصل دوم۔ تعبیر رؤیا اور معاشرتی مسائل

باب سوم: انفرادی اور اجتماعی معاشرتی اخلاقی مسائل اور ان کے اثرات

فصل اول۔ انفرادی معاشرتی اخلاقی مسائل اور ان کے اثرات

فصل دوم۔ اجتماعی معاشرتی اخلاقی مسائل اور ان کے اثرات

نتائج----------

سفارشات----------

فصل دوم: معاشرے کا معنی و مفہوم، ضرورت و ارتقاء

معاشرہ کی تعریف

باہم مل جل کر رہنا، انسانی ماحول، سماج اور سوسائٹی۔ معاشرہ کے لئے انگریزی میں لفظ سوسائٹی (Society) استعمال ہوا جو لاطینی زبان کے لفظ (Cocius) سے ماخوذ ہے۔ سوسائٹی کا لفظی معنی ہے گروہ، قوم، جماعت، مجلس، طرز زندگی۔ کثیر التعداد بنی نوع انسان کی وہ جماعتی زندگی جس میں ہر فرد کو رہنے سہنے اور اپنی ترقی، حصول مقصد اور فلاح و بقاء کے لئے دوسروں سے سابقہ پڑتا ہے اور جس ماحول سے کسی فرد و بشر کو مفر نہیں معاشرہ کہلاتا ہے۔[1]

معاشرہ کی ضرورت

دنیا میں بے شمار انسان آباد ہیں، اگر تصور کیا جائے کہ زمین پر صرف ایک ہی فرد موجود ہو تو اُس کی زندگی بالکل مختلف ہوتی۔ وہ تنہائی میں رہتے ہوئے دن اور رات کیسے گزارتا، یہ صرف ایک خیال ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا شخص شاید بولنا بھی نہ سیکھ پاتا، کیونکہ زبان تب ہی وجود میں آتی ہے جب دوسروں سے بات کرنے کی ضرورت ہو۔ اُس کے نہ کوئی رشتہ دار ہوتے، نہ قبیلہ اور نہ دوست۔ اُس کے گرد صرف درخت، پہاڑ اور جنگلات ہوتے، مگر معاشرتی اصول، رسم و رواج اور تہذیب کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اکیلا مکمل نہیں ہو سکتا؛ ایک خوشحال زندگی کے لیے معاشرے کا وجود ضروری ہے، کیونکہ معاشرہ ہی انسان کو پہچان، تعلق اور مقصد دیتا ہے۔

معاشرہ کی اہمیت:

اسلام ایک فلاحی اور مثالی معاشرہ قائم کرنے کیلئے بہترین اصول وضوابط مہیا کرتا ہے۔ اسلامی معاشرہ محدود سوسائٹی کا نام نہیں بلکہ روئے زمین پر بسنے والے مسلمانوں کی اس طرفہ زندگی کا نام ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہو۔ دنیا کا ہر وہ انسان جس نے ایک بار صدق دل سے کلمہ پڑھ لیا وہ اسلامی معاشرے کا رکن بن گیا۔ اسلام لوگوں کو مل جل کر رہنے اور آپس میں اچھا برتاؤ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق روئے زمین کے تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔[2] اس طرح تمام انسان ایک ہی خاندان اور ایک ہی معاشرہ کے افراد ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

يَأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً[3]

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو کہ اس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت پیدا کیئے۔

تنظیم معاشرت:

معاشرت باہم مل جل کر رہنے یا مل کر زندگی بسر کرنے کا نام ہے مل کر رہنے کا یہ میلان حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے اور انسان میں بھی مگر حیوانات کا اجتماع محض ان کی جبلت کا تقاضا ہے اور انسان کے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد بہر حال ہوتا ہے۔ اس لئے معاشرہ انسانوں ہی کی باہمی زندگی کو کہتے ہیں۔

---

[1] عبد الرحمن ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، مطبع کوا پریٹو اسٹیم پریس، ۱۹۲۴، ص ۴۹

[2] ڈاکٹر خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران و تاجران کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، ص ۵۲

[3] سورۃ النساء:۱

معاشرے کے مقاصد:

ایک فرد بغیر معاشرے کے زندگی نہیں گزار سکتا۔ اور افراد کے وجود کے بغیر معاشرہ کا قیام ناممکن ہے دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر بے کار و بے سود ہیں۔ معاشرے کے مقاصد کچھ اس طرح ہیں۔

۱۔ فطری ضرورت:

انسان نے معاشرے کی تخلیق ایک فطری ضرورت کے تحت کی وہ جانتا تھا کہ بغیر معاشرہ کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

۲۔ ضروریات زندگی کو پورا کرنا:

اکیلا اور تنہا انسان اپنی تمام تر ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ہی انسان بیک وقت کسان، لوہار اور کپڑا بننے کے کام نہیں کر سکتا تھا۔ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے تحت معاشرہ وجود میں آیا۔[1]

۳۔ بقائے نسل انسانی:

انسان پیدائش کے وقت اتنا کمزور ہوتا ہے۔ کہ اگر اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے تو اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ انسانی نسل کی بقاء کا مقصد صرف معاشرہ کے وجود کے تحت ہی ممکن ہے۔

۴۔ فرصت و فراغت اور تفریح:

اگر تنہا انسان کو اپنی ضروریات پوری کرنا پڑیں تو سارا دن ان کی تکمیل میں زندگی گزار دے گا۔ لیکن اب معاشرہ کے تحت آجانے سے نہ صرف ضروریات زندگی کے حصول میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ اسے کچھ وقت فرصت و فراغت کا مل جاتا ہے اور وہ اپنے اس فارغ وقت میں تفریح جیسی ضرورت سے بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ سائنسی ایجادات، تہذیب و تمدن کی ترقی سب ان فرصت و فراغت کے لمحات کا ثمر ہے۔[2]

۵۔ شخصیت سازی:

معاشرہ شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معاشرے ہی میں آکر انسان کے سارے جوہر کھلتے اور صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ مختلف انسانوں کی خوبیوں میں اسی وقت نکھار آتا ہے جب وہ باہمی اتحاد و تعلقات سے کام لے گا۔

۶۔ حقوق و فرائض کا احساس:

معاشرے میں رہتے ہوئے انسان اپنے حقوق و فرائض سے روشناس ہوتا ہے حقوق و فرائض کی پہچان سے معاشرہ کو بھی ترقی ہوتی ہے۔ اور فرد کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

۷۔ اجتماعی ترقی:

معاشرہ کا نصب العین ہی اجتماعی خوشحالی و ترقی ہے، معاشرہ وجود میں آتا ہی اس لئے ہے کہ افراد اپنی انفرادیت اور انفرادی قوتوں کو ایک اجتماعی اتحاد میں منسلک کر کے اپنی منزل ترقی و خوشحالی سے ہمکنار ہو سکیں۔

معاشرے کا پھیلاؤ اور اس کی ہمہ گیری:

جس قدر لوگوں کے مفادات ہم آہنگ ہوتے گئے، معاشرے کا پھیلتا گیا اور سماج ترقی کرتا گیا۔ کیونکہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ سماج

---

[1] خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، الفاروق بک فاونڈیشن لاہور، ۱۹۹۷ص ۲

[2] ایضا، ص ۲

میں مل کر کام کرنے سے حاصل ہونے والا مشترکہ فائدہ ایک فرد یا ایک خاندان کی حیثیت میں حاصل ہونے والے فائدے سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی لیے وہ اپنی انفرادی خواہشات پر سماجی مفادات کو ترجیح دیتے رہے۔ اس کے نتیجے میں ترقی کسی ایک مقام پر آکر رکی نہیں، بلکہ اب انسانیت ایک ایسے ہمہ گیر انسانی معاشرے کی متلاشی ہے جس میں روئے زمین کے تمام باشندے برادرانہ رشتے میں پروئے ہوئے ہوں۔[1]

اسلام فرد کی تربیت، کردار سازی اور سیرت گری پر بہت زور دیتا ہے کیونکہ افراد ہی مل کر معاشرہ تشکیل کرتے ہیں۔[2]

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ[3]

معاشرت پسندی کے اسباب:

انسان کی معاشرت پسندی کے اسباب دو ہیں۔ ا۔ خارجی ۲۔ داخلی

ا۔ خارجی سبب اس کی کمزوری ہے انسان جسمانی ساخت کے اعتبار سے کمزور ہے حالانکہ دوسرے حیوانوں کو قدرت نے جسمانی لحاظ سے اس طرح مسلح کیا ہے کہ وہ حملوں، حالات اور مشکلات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ انسان کو چونکہ قدرتی ہتھیاروں سے محروم کیا ہے اس لئے وہ اکیلے فطری عوامل کا مقابلہ کر سکتا ہے نہ دوسرے عملوں کا دفاع وہ مجبور ہے کہ خارجی ماحول سے نمٹنے کے لیے تعاون حاصل کرے۔ یہی مجبوری اس کی اجتماعیت کا سنگ بنیاد ہے[4]

۲۔ داخلی سبب اس کی فطری خواہش ہے ابن خلدون کے الفاظ میں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ "افراد انسانی کا اکھٹے مل جل کر رہنا ایک ناگزیر امر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے اہل علم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے"۔[5]

اسلام اور نظریہ اجتماع:

فطری معاشرت پسندی کی تائید بھی اسلامی اصولوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً انسانی معاشرت کا سنگ بنیاد مرد و عورت کا تعلق ہے قرآن اسے رحمت و مودت قرار دیتا ہے، رشتہ داروں کے تعلق کو بھی اسی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر خلافت ارضی کا تصور فطری رجحان اور ماحول کے تقاضوں کی عکاسی کرتا ہے۔

قولہ تعالی: وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا[6]

اللہ وہ ذات ہے جس نے آدمی کو پانی سے پیدا کیا اور اسے نسب اور سسرال والا بنایا۔

معاشرتی تنظیم وارتقاء:

انسان اپنی طبیعت، ماحول، خواہشات اور دیگر عوامل کی وجہ سے معاشرتی تشکیل کیلئے مجبور ہوا۔ اسی تشکیل کو معاشرتی تنظیم کہہ سکتے ہیں۔ اس سے مراد انسانی ضروریات کی تعمیل کیلئے مربوط کوشش کرنا ہے۔ معاشرتی تنظیم کے ارتقاء کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

ا۔ تدریجی تعلیم و تربیت نے انسانی معاشرت کو زیادہ منظم کیا۔

---

[1] محمد قطب، اسلام کا نظام تربیت، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۳۵۹

[2] سیدہ بشریٰ تابش، تعلیمات نبوی ﷺ اور ہماری زندگی، مکتبہ دارالبلاغ، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص: ۸۵

[3] ارمغان حجاز از علامہ اقبال، ناشر: شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۱۸

[4] خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، ص: ۲

[5] ابن خلدون، المقدمہ ابن خلدون، ص: ۴۳۹

[6] سورۃ الفرقان: ۵۴

۲۔ فنی مہارت نے اسے ماحول پر قابو پانے کی صلاحیت دی۔

۳۔ ذہنی و عقلی نشو ونما نے اسے وہ صلاحیت عطا کی جسے زیادہ وسیع پیمانے پر تلاش کر کے میل جول بڑھانے لگا اور اسکی وجہ سے انسانی مسائل کی معاشرتی تنظیم ہونے لگی۔[1]

اس اعتبار سے معاشرتی تنظیم ایک ایسی تنظیم ہے جس میں انسان کی معاشی، سیاسی، قانونی مذہبی اور قلیمی جدوجہد سمودی گئی ہے بلکہ اس کے مجموعے کا نام معاشرتی تنظیم وارتقاء ہے۔[2]

معاشرہ ایک وحدت:

جب معاشرہ کسی پر ایک ذمہ داری ڈالتا ہے تو اس کا مقصد ہر گز یہ نہیں ہوتا کہ دوسرے ہر قسم کے اداروں اور شعبوں سے اس کا رابطہ منقطع کر دیا جائے۔ اس کا اصل مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ اس شعبے میں وہ آپ نے صلاحیتوں اور دل و دماغ کو سب سے زیادہ استعمال کرے اور آپ نے آپ کو اس میں کامل مشغول رکھے۔ ہر فرد کل کا جزو ہے ہر فرد کو ایک ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اس کل کا ہر جزو اپنے اپنے مفوضہ فرائض کی انجام دہی میں سر تا پا غرق ہے تا کہ کل کی تعمیر اور استحکام جاری رہے۔ کسی ایک جزو کی غفلت اور لا پرواہی چاہے اسکی نوعیت کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو کل کی عمارت کو دھڑام سے زمین پر گرا دے گی۔ یہ اس لیے کہ معاشرہ ایک وحدت ہے۔[3]

اسلامی معاشرہ اطمینان کا نقطہء معراج:

وہ آپ نے بنی نوع انسان کو ذلیل وخوار اور اسے ہڑپ نہیں کرتا بلکہ اس کے غم اور رنج کو آپ نا غم اور اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے وہ آپ نے پیٹ کاٹ کر دوسروں کی حاجت روائی کرتا ہے۔ وہ لوٹ مار ظالمانہ استحصال اور طبقاتی نفرت کا نہیں بلکہ عدل و انصاف، ایثار و محبت کا پیکر مجسم بن جاتا ہے۔ اسیطرح وہ پوری انسانیت کو اللہ کے ایسے سایہ رحمت میں ڈھانپ لیتا ہے۔ جہاں نہ خوف ہے نہ حزن نہ بے چینی ہے۔ اور نہ اضطراب بلکہ ہر چیز آپ نے مرکز اور آپ نے نقطہ پر قائم ہے۔ محمد عربی ﷺ نے جو معاشرہ قائم کیا وہ اس دور عافیت و اطمینان کا نقطہ معراج تھا اور انہوں نے قیامت تک انسانیت کی فلاح کیلئے یہی شاہراہ متعین کی۔[4]

قرآن مجید کا تصور معاشرہ:

الہامی کتابوں میں قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جسے صحیح معنوں میں اجتماع و معاشرے کی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مخاطب وہ انسان ہیں جو آبادیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر باہمی تعاون و اشتراک سے زندگی گزارتے ہیں۔ قرآن مجید میں جتنے بھی احکامات ہیں ان میں اجتماعیت کا گہرا رنگ نظر آتا ہے اللہ کا عقیدہ ہو یا قیامت کا رسولوں کا اسی طرح عبادت میں صلوۃ ہو یا زکوۃ، روزہ ہو یا حج تبلیغ ہو یا جہاد، ایسے ہی عائلی قوانین ہوں یا معاشی و معاشرتی احکام، سیاسی اصول ہوں یا آئینی ضابطے، ان سب کا تعلق معاشرے سے ہے گویا قرآن مجید کی جملہ تعلیمات کا مزاج اجتماعی ہے۔[5]

---

[1] خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، ص:۱۰

[2] ایضاص:۱۰

[3] افضل الرحمن، دور جدید میں مسلمان عورت کا کردار، مترجم محمد ایوب منیر، ص:۱۱

[4] مولانا سمیع الحق، اسلام اور عصر حاضر، موتمر المصنفین، پشاور، ۱۹۷۴ء، ص:۳۵

[5] رشید احمد جالندھری، قرآن مجید اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، ۱۹۸۰ء ص:۲۱

قرآن مجید میں اجتماعیت کا تصور کسی حد تک کار فرما ہے اس کا اندازہ ہمیں ان آیات سے ہوتا ہے۔ جن کا تعلق صرف اہل ایمان سے ہے یا پورے نسل انسانی سے مثلا اہل ایمان کو نوے جگہ (یاایُّھَا الَّذِینَ امنوا) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے اور نسل انسانی کو پھیں جگہ (یاایُّھَا النَّاسُ) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

قرآن پاک انسانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ[1]

یقینا اللہ تعالیٰ سب انسانوں پر فضل فرماتا ہے لیکن اکثر انسان اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

دوسری آیت جن میں آفاقیت ہے وہ وہ ہیں جن کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ پوری انسانیت کے رسول اور اقوام عالم کیلئے رحمت ہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنَكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا[2]

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر پوری انسانیت کیلئے بشیر اور نذیر بنا کر۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا۔ قُلْ يَأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا[3]

اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے کہ اے انسانوں میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میری رسالت تم سب کیلئے ہے۔"

وَمَا أَرْسَلْنَكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَلَمِينَ[4]

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ ﷺ کو مگر اقوام عالم کیلئے رحمت بنا کر۔

اس لیے اسلامی معاشرے کو نبی رحمت ﷺ کی محبت میں ڈوبا ہوا ہونا چاہیے۔[5] قرآن مجید میں سینکڑوں ایسی آیات ہیں جو پوری انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن مجید ایک ایسے معاشرے کا علمبردار ہے جس میں عالمگیر وسعت ہو۔

معاشرتی زندگی کے اہم اصول:

آپ ﷺ کے ارشادات 1: **اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَمَا هُنَّ، قَالَ: الشِّرْكُ بِاللَّهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ، وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ.**[6]

سات ہلاک کر دینے والی باتوں سے بچو لوگوں نے پوچھا کہ وہ کونسی باتیں ہیں کسی کو خدا کا شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، اسکے بعد اس جان کا مارنا

جس کا خدا نے حرام قرار دیا ہو۔ سوائے حق شرعی کے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، لڑائی کے روز پست دکھانا، پاکدامن مومن اور بے خبر عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

مذکورہ حدیث "**اجْتَنِبُوا السَّبْعَ**" سے حاصل شدہ معاشرتی اصول:

1. عقیدے کی پاکیزگی کا اصول: اجتماعی نظام میں خالص توحید اور اللہ پر ایمان ہی اصل استحکام کا ذریعہ ہے۔

---

[1] سورۃ البقرہ ۲:۲۴۳

[2] سورۃ السبا:۲۸

[3] سورۃ اعراف:۱۵۸

[4] سورۃ الانبیاء:۱۰۷

[5] ماہنامہ کوثر از خان انعام اللہ خان مرحوم ص:۸

[6] بخاری، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الوصایا باب قول اللہ ان الذین یاکلو، مکتبہ البشری، ح:۲۷۶۶

2 . علم و عقل کے احترام کا اصول: معاشرہ میں علمی و سائنسی بنیاد پر ترقی ہو، فریب و توہم پرستی کا خاتمہ کیا جائے۔

3 . انسانی جان کے احترام کا اصول: معاشرے میں امن، عدل اور انسانی جان کی حرمت کو یقینی بنانا لازم ہے۔

4 . معاشی عدل و انصاف کا اصول: سود سے پاک، منصفانہ اور خیر خواہی پر مبنی اقتصادی نظام قائم کیا جائے۔

5 . کمزوروں کے حقوق کے تحفظ کا اصول: کمزور، یتیم اور بے سہارا طبقات کی مالی و سماجی کفالت ریاست و معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔

6 . قوم و ملت کے دفاع کا اصول: قوم کی اجتماعی حفاظت، شجاعت، اور قربانی کا جذبہ معاشرتی بقا کے لیے ضروری ہے۔

7 . عزتِ نفس اور عفت کی حفاظت کا اصول: عزت و عفت کی حفاظت، کردار کشی اور بدگمانی سے اجتناب معاشرتی سکون کی علامت ہے۔

2: إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ، وَلَا تَحَسَّسُوا وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا تَنَاجَشُوا وَلَا تَحَاسَدُوا وَلَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَدَابَرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا[1]

بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑھ کر جھوٹ بات ہے اور نہ کسی کی راز جوئی کرو اور نہ کسی کی جاسوسی کرو اور قیمت بڑھانے کی بولی دو اور نہ ایک دوسرے سے بغض رکھو اور نہ باہم روگردانی کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔

حدیثِ "**إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ**" سے حاصل شدہ معاشرتی اصول:

1 . اعتماد و حسنِ ظن کا اصول: بدگمانی معاشرتی اعتماد کو ختم کر دیتی ہے: معاشرہ میں باہمی اعتماد، خیر خواہی اور حسنِ ظن کو فروغ دینا چاہیے۔

2 . نجی زندگی کے احترام کا اصول: ہر فرد کو اپنی نجی زندگی کا حق حاصل ہے، دوسروں کی پرائیویسی کا احترام لازمی ہے۔

3 . حسد سے پاک دل رکھنے کا اصول: دوسروں کی کامیابی پر خوش ہونا، اور نعمتوں کو اللہ کی تقسیم سمجھنا۔

4 . بغض و نفرت کے خاتمے کا اصول: دوسروں کے ساتھ درگزر، نرمی اور صلح پسندی کا رویہ اپنایا جائے۔

5 . قطع تعلقی سے اجتناب کا اصول: تعلقات کو جوڑنے، صلح کرانے اور میل جول بڑھانے کی کوشش کرنا۔

6 . اخوت و بھائی چارے کا اصول: تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، رنگ، نسل یا مقام کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں۔

3: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَالْإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ فِي أَهْلِهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا رَاعِيَةٌ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالْخَادِمُ فِي مَالِ سَيِّدِهِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ. قَالَ: فَسَمِعْتُ هَؤُلَاءِ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَحْسِبُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: وَالرَّجُلُ فِي مَالِ أَبِيهِ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ[2]

یاد رکھو! تم میں سے ہر شخص کو نگہبان مقرر کی گیا ہے، اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی ماتحت رعیت کے بارے میں باز پرس ہو گی، پس سربراہ مملکت جو سب لوگوں کا حاکم ہے وہ ان سب کا نگہبان ہے اور اس سے رعیت کے ایک ایک فرد کے بارے میں باز پرس ہو گی، ایک عام آدمی آپ نے گھر والوں پر نگران ہے، اس سے اپنے زیر رعیت لوگوں کے بارے میں باز پرس ہو گی، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر نگران ہے، اس سے ان کے بارے میں باز پرس ہو گی، اور گھر کا نوکر اپنے آقا کے مال کا نگران ہے، اس سے اس کے بارے میں باز پرس ہو گی۔ یاد رکھو! کہ تم میں سے ہر شخص نگران ہے، اور ہر شخص سے اس کی ماتحت رعیت کے بارے میں باز پرس ہو گی۔

حدیثِ "**كُلُّكُمْ رَاعٍ**" سے حاصل شدہ معاشرتی اصول

1 . ذمہ داری اور جوابدہی کا اصول: یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق ذمہ دار ہے۔

---

[1] بخاری، ح:٦٠٦٦

[2] بخاری، ح:٢٥٥٨

حکمران رعایا کا ذمہ دار، باپ خاندان کا، عورت گھر کی، ملازم اپنے کام کا۔

اصول: اسلام میں کوئی فرد غیر ذمہ دار نہیں۔ معاشرتی نظام تبھی قائم رہتا ہے جب ہر شخص اپنی ذمہ داری کو امانت سمجھے۔

2 . امانت و دیانت کا اصول: جب ہر ذمہ داری ایک "امانت" ہے تو اسے خیانت سے بچا کر ادا کرنا فرض ہے۔

اصول: عہدے، وسائل اور اختیارات سب امانت ہیں؛ ان کا درست استعمال معاشرتی انصاف کا تقاضا ہے۔

3 . عدل و انصاف کا اصول: حاکم سے لے کر عام فرد تک ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے دائرے میں عدل کرے۔

اصول: انصاف کے بغیر کسی بھی سطح پر معاشرتی امن ممکن نہیں۔

4 . خاندانی نظام کے استحکام کا اصول: شوہر اور بیوی دونوں اپنی اپنی جگہ گھر کے نظام کے ذمہ دار ہیں۔

اصول: گھر کی بنیاد محبت، عدل اور باہمی تعاون پر ہونی چاہیے۔ یہی ایک مضبوط معاشرتی ڈھانچے کی جڑ ہے۔

5 . سماجی نظم و ضبط کا اصول: اگر ہر فرد اپنی ذمہ داری نبھائے تو پورا معاشرہ خود بخود منظم اور پُرامن ہو جاتا ہے۔

اصول: انفرادی احساسِ ذمہ داری اجتماعی نظم کا ضامن ہے۔

6 . قیادت اور رعایا کے تعلق کا اصول: اسلام میں قیادت خدمت ہے، حکمرانی نہیں۔

اصول: قائد یا حاکم رعایا کے مفاد کے لیے کام کرے، نہ کہ ذاتی مفاد کے لیے۔ رعایا کے حقوق کا تحفظ اُس کی اولین ذمہ داری ہے۔

7 . احتساب و مواخذے کا اصول: حدیث میں فرمایا گیا: "وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ "یعنی ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہو گا۔

اصول: جوابدہی کا نظام اسلامی معاشرت کا بنیادی ستون ہے۔ کوئی شخص اپنی حیثیت میں محاسبے سے مستثنیٰ نہیں۔

قوموں کی زندگی کا پیمانہ بھی ذمہ داریوں کا شعور ہے۔ ایک زندہ قوم وہی کہلاتی ہے جس کا ہر طبقہ بلکہ ہر فرد اپنے فرائض کا شعور رکھتا ہو اور پوری ذمہ داری کیساتھ اپنے فرائض کو بجالاتا ہے۔[1]

صالح معاشرہ:

اسلامی نقطہ نظر سے معاشرہ کے استحکام اصلاح کا مدار اس پر ہے کہ معاشرہ کے افراد خیر اور بھلائی کیلئے ایک دوسرے کے مددگار بنیں اور گناہ و ظلم کیلئے ایک دوسرے سے تعاون نہ کریں۔ قرآن حکیم نے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى ص وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ[2]

نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں باہم کسی کی مدد نہ کرو۔

اسلام ایک تو خالص فکری بنیادوں پر ایسے افراد تیار کرتا ہے جو منشاء اسلام سے لگانگت رکھتے ہوں۔ اور ان کے طرز عمل میں شیطانی و نفسانی محرکات غالب نہ ہوں۔[3]

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: مَنْ مَشَى مَعَ ظَالِمٍ لِيَقْوِيَهُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ[4]

وجس نے ظالم کے ساتھ اس کی تقویت کی خاطر قدم اٹھایا ہے اور وہ اسے جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا۔

---

[1] حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی، معاشرتی بگاڑ کا سد باب، مکتبہ لدھیانوی، کراچی، ۱۹۹۵، ص ۱۱۷

[2] سورۃ المائدہ ۵:۲

[3] منشی عبد الرحمن خان، اسلام کا معاشرتی نظام، ص ۵۴

[4] رواہ البیھقي في شعب الإیمان، ح ۷۶۷۵

فصل سوم: منتخب تفاسیر کے مؤلفین کا تعارف

معارف القرآن کے مؤلف کا تعارف

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے بعض بندوں کو دینِ اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ ہر دور میں ایسے برگزیدہ ہستیاں امتِ مسلمہ کی رہنمائی کرتی رہی ہیں۔ دینِ اسلام کے کلیات و جزئیات کا یہ وسیع ذخیرہ دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض کا نتیجہ ہے، جو صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے ذریعے نسل در نسل ہم تک پہنچا ہے۔ مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ انہی منتخب اور برگزیدہ علماء میں سے ایک ہیں جنہوں نے دین کی خدمت اور اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔

آپ کا نام محمد شفیع ہے۔ یہ نام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی[1] نے رکھا۔ آپ کے والد کا نام محمد یاسین بن تحسین علی بن میاں جی امام علی تھا۔ سلسلہ نسب حضرت عثمان سے جاملتا ہے۔ آپ 20، 21 شعبان المعظم 1314ھ کی درمیانی شب بمطابق جنوری 1897ء کو دیوبند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔[2] آپ نے دینی ماحول میں تربیت پائی۔

علم کا شوق بچپن سے تھا۔ پانچ سال کی عمر میں دار العلوم دیوبند میں قرآن کی تعلیم شروع کی۔ فارسی کی تمام مروجہ کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ حساب و فنون ریاضی کی تعلیم اپنے چچا سے حاصل کی وہ بھی دار العلوم میں استاد تھے۔ فن تجوید کی بقدر ضرورت تعلیم سے حاصل کی۔[3] سولہ سال کی عمر میں دارالعلوم کے درجہ عربی میں داخل ہوئے۔ 1335ھ میں دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے اور جن عظیم المرتبت علمائے امت سے حضرت مفتی اعظم نے شرف تلمذ حاصل کیا ان میں امام العصر محمد انور شاہ کشمیری[4]، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ[5]، شیخ الادب مولانا اعزاز علی دیوبندی[6] جیسے اکابرین شامل ہیں جو اپنے اپنے شعبوں میں اپنی نظیر آپ تھے۔[7] طالب علمی کے زمانے میں کتب بینی کا ذوق رکھتے تھے۔ علمی مزاج کے بارے میں آپ کے بیٹے مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

حضرت مفتی محمد شفیع عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ دوپہر کے وقت جب دارالعلوم میں کھانے اور آرام کا وقفہ ہوتا، تو میں اکثر کتب خانے میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت ناظمِ کتب خانہ بھی آرام کے لیے گھر جاتے تھے، اس لیے ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ میری خاطر وہاں رُکے رہیں۔ میں نے ان سے اصرار کر کے اجازت حاصل کی کہ وہ جاتے ہوئے مجھے اندر چھوڑ کر باہر سے تالا لگا دیں۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے، اور میں ساری دوپہر اس علمی خزانے کے گلزار میں مطالعہ میں مشغول رہتا۔

---

[1] رشید احمد گنگوہی ایک ہندوستانی سنی عالم دین، فقیہ، مفسر اور محدث تھے۔ وہ 1829 میں پیدا ہوئے اور 1905 میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ جنگ آزادی کے مجاہد، دارلعلوم دیوبند کے سرپرست اور شیخ طریقت بھی تھے۔ ان کے فتاویٰ کا مجموعہ "فتاویٰ رشیدیہ" کے نام سے مشہور ہے۔

[2] حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، بیس علمائے حق، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور، ص ۲۵۶

[3] حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، پچاس جلیل القدر علما، المیزان اردو بازار لاہور، سن اشاعت ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۱

[4] آپ برصغیر کے جلیل القدر محدث، مفسر اور فقیہ تھے۔ 1292ھ میں کشمیر میں پیدا ہوئے اور دارالعلوم دیوبند سے تعلیم حاصل کی۔ آپ کی علمی گہرائی، حافظہ اور حدیث پر عبور نے آپ کو "امام العصر" کا لقب عطا کیا۔ آپ کی مشہور تصنیف * فیض الباری شرح بخاری * ہے۔ وفات 1352ھ میں ہوئی۔

[5] آپ ممتاز عالمِ دین، مفسرِ قرآن اور قیامِ پاکستان کے حامی علما میں سے تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردِ رشید تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ نے * ترجمہ و تفسیرِ قرآن * مکمل کی۔ آپ نے 1949ء میں وفات پائی اور کراچی میں مدفون ہیں۔

[6] آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فقیہ اور محدث تھے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد اور دارالعلوم کے صدر مدرس رہے۔ اصولِ فقہ اور حدیث کے ماہر تھے۔ آپ نے طلبہ کی علمی تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وفات 1370ھ میں ہوئی۔

[7] حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، اکابر علمائے دیوبند، ادارہ اسلامیات لاہور، طبع جدید ۱۹۹۹، ص ۲۴۸

دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو میری نظر سے نہ گزری ہو۔ اگر کبھی کوئی کتاب نہ ملتی تو میں فوراً بتا دیتا کہ وہ کس الماری میں رکھی ہے۔ بسا اوقات لائبریری کے انچارج کو بھی کتاب کا مقام معلوم نہ ہوتا اور میں رہنمائی کر دیتا۔ یہی گہرا شغف تھا جس نے آپ کو علمی میدان میں بلند مقام عطا کیا۔ بعد ازاں 1336ھ میں مولانا حبیب الرحمن عثمانی کی زیرِ سرپرستی دارالعلوم دیوبند میں بطور مدرس آپ کی تقرری ہوئی، جہاں آپ کی ابتدائی تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ مقرر کی گئی۔

آپ اپنی تنخواہ کا بیشتر حصہ کتب خریدنے میں صرف کرتے تھے۔ ایک محقق کے لیے کتاب بنیادی ضرورت ہے۔ 1362ھ میں دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا۔ ستائیس سال کے عرصے میں بارہ طویل و عریض الماریوں پر مشتمل ذاتی لائبریری بنائی۔ ایک محقق کو درکار بنیادی کتب لائبریری میں جمع تھیں۔ 1367ھ میں آپ نے دیوبند سے پاکستان ہجرت کی۔ اپنی بیشتر کتب جو زندگی کے سرمائے کی حیثیت رکھتی تھیں ساتھ لے آئے۔ پاکستان میں تحقیق کے لئے آپ کی لائبریری سے استفادہ کرتے تھے۔ تدریس کے دوران سب سے پہلے ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ عربی، فارسی اور اردو ادب میں مہارت حاصل کی۔ عربی ادب میں امرء القیس اعشیٰ، کعب بن زہیر، حسان اور متنبی کے ساتھ خصوصی مناسبت تھی۔ حکمت، سوز اور سادگی سے بھرپور اشعار آپ کو پسند تھے۔ عربی اشعار کا مجموعہ نفحات کے نام سے شائع کیا۔ فارسی ادب میں مولانا جامی اور رومی کے اشعار یاد تھے۔ اردو ادب میں علامہ اقبال اور جگر مراد آبادی کو آپ کثرت سے پڑھتے تھے۔ آپ کا ذاتی بیاض حکمۃ الاشعار تھا جس میں آپ اپنے پسندیدہ اشعار جمع کرتے تھے۔ اس کا کچھ حصہ "کشکول"[1] میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ اپنی تصنیف کشکول کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

اردو کا مقولہ ہے، زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو آپ کا لقب "مفتی اعظم ہر شخص کی زبان پر تھا۔ آپ معروف اور متداول فقہی کتب کے ساتھ تفصیلی کتابوں کو اپنے مطالعے میں رکھتے تھے۔ فتوی لکھنے سے پہلے متعلقہ تمام کتب کی مراجعت کرتے تھے۔ خاص موضوعات پر چھپنے والے رسائل پر بھی نظر رکھتے تھے۔ نایاب رسائل فوٹو سٹیٹ کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے خود اپنے ہاتھ سے قلمبند کرتے تھے۔ آپ فتوی کے لئے آسان زبان استعمال کرتے تھے۔ فارسی اور عربی کی مشکل اصطلاحات سے گریز کرتے تھے۔ آپ اپنے ایک عظیم بیاض موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دے رکھا تھا دوران مطالعہ اہم مسائل کا حوالہ موضوع کے تحت درج کر لیا کرتے تھے۔ فقیہ النفس سے مراد اصطلاح فقہاء میں وہ شخص ہے جسے اللہ نے فقہ میں کثرت مماثلت کی وجہ سے ایسا ذوق سلیم عطاء کیا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتا ہو۔ علامہ زاہد الکوثری نے آپ کو فقیہ النفس کا خطاب دیا تھا۔[2]

علم تفسیر تمام علوم کی ماں ہے۔ عمر کے آخری حصے میں آپ قرآن کی تلاوت تدبر کے ساتھ کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ابتداء میں علم تفسیر کے ساتھ کوئی خاص شغف نہ رہا لیکن اب سب سے زیادہ دلچسپی اور شغف علم تفسیر کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔[3] حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی نگرانی میں احکام القرآن تصنیف فرمائی۔ اردو زبان میں آسان اور عام فہم تفسیر معارف القرآن علم تفسیر میں مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

---

[1] "کشکول" مفتی محمد شفیع عثمانیؒ کی علمی و ادبی شان کا مظہر ہے۔ یہ کتاب دراصل مختلف موضوعات پر ان کے خطبات، مضامین اور علمی نکات کا مجموعہ ہے، جن میں دینِ اسلام کی تعلیمات، اخلاقی اصلاح، روحانی تربیت اور معاشرتی رہنمائی کے پہلو نمایاں ہیں۔" کشکول" میں مفتی صاحبؒ نے قرآن و سنت کی روشنی میں انسانی زندگی کے مختلف مسائل کا مدلل اور حکیمانہ حل پیش کیا ہے۔ اس میں فقہی مسائل سے لے کر روزمرہ اخلاقی امور تک، ہر موضوع کو عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے تاکہ قاری نہ صرف علم حاصل کرے بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی اس سے رہنمائی لے سکے۔ یہ کتاب ان کے گہرے مطالعے، وسیع تجربے اور خالص دینی اخلاص کی عکاس ہے۔ "کشکول" کا مطالعہ قارئین کے لیے ایمان، عمل اور اخلاق میں بہتری کا باعث بنتا ہے۔

[2] مفتی تقی عثمانی، میرے والد میرے شیخ اور ان کا مزاح و مذاق، ادارالمعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء ص ۵۸

[3] ایضا، ص، ۸۵

تصانیف

آپ کے قلم فیض سے تین سو کتب منصہ شہود پر آئیں۔[1] آپ کی مشہور تصانیف حروف تہجی کے اعتبار سے درج ذیل ہے۔

1. آداب الشیخ والمرید
2. آداب المساجد
3. آداب النبی صلی علی ترینم
4. آلات جدیدہ کے شرعی احکام
5. آلہ مکبر الصوت
6. احکام خطبہ
7. اسلام اور موسیقی
8. اسلام اور نبی امتیازات
9. اسلام کا نظام اراضی
10. اسلام کا نظام تقسیم دولت
11. اسود حسینی (شہید کربلا
12. احکام القرآن (عربی
13. اعضاء انسانی کی پیوند کاری
14. امداد المقیمین
15. اوزان شرعیہ
16. بیمہ زندگی
17. بیمہ کے احکام و مسائل
18. تحذیر الامام عن رسم الخط من مصحف الامام
19. تصویر کے شرعی احکام
20. تعدیل الہادی فی تقبیل الایادی
21. تفسیر معارف القرآن
22. جواہر الفقہ
23. چند عظیم شخصیات
24. حرف ضاد سے متعلق رسالہ
25. ختم نبوت
26. خطبات جمعہ و عیدین

[1] حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، اکابر علمائے دیوبند، ادارہ اسلامیات لاہور، مطبع جدید ۱۹۹۹ء، ص ۲۱۱

27. درس عبرت
28. دلائل القرآن علی مسائل النعمان
29. دل کی دنیا
30. ذکر اللہ اور درود شریف کے فضائل و احکام
31. رؤیت ہلال
32. شرک و بدعت
33. سیرت خاتم الانبیاء
34. صیانۃ القرآن عن تغییر الرسم واللسان
35. فتوح البند
36. قصد السبیل
37. گناہ بے لذت
38. مجالس حکیم الامت
39. مسئلہ سود
40. مقام صحاب
41. میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات
42. نقوش و تاثرات
43. بدیۃ المہدین فی آیت خاتم النبیین (عربی)

آپ کی دینی خدمات

آپ اپنی ذات میں انجمن تھے 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد کراچی کورنگی کے مقام پر دار العلوم کی بنیاد رکھی۔ آپ نے 1386ھ میں ماہانہ جریدہ 'البلاغ" جاری کیا۔ آج یہ جریدہ بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ عربی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ آپ مفسر، فقیہ، صوفی اور تحریک پاکستان کے سرگرم راہنما تھے۔ قیام پاکستان کے بعد 1949ء میں اسلامی قانون کی تدوین کے لئے کمیٹی کے رکن بنے۔[1]

وفات: آخری عمر میں عارضہ قلب کی وجہ سے بینائی کمزور ہوئی۔ چار سال بعد 5 اور 6 اکتوبر 1976ء کی درمیانی شب وفات پا گئے۔[2]

[1] حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، بیس علمائے حق، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور ص ۲۷۰

[2] ، محمد منصور، انار کے درخت تھے، مکتبہ شہداء، کراچی سن طباعت ۱۴۲۸، ص ۱۴۴

ضیاءالقرآن کے مؤلف کا تعارف

خاندانی پس منظر:

پیر کرم شاہ کے والد ماجد غازی اسلام امیر جد اللہ کی شخصیت نے آپ کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔ آپ کے والد باہمت، صوفی، درویش، دور اندیش مذہبی رہنماء، عہد آفریں و تاریخ ساز شخصیت تھے۔

جب آپ سن شعور کو پہنچے تو تعلیم قرآن کے لیے اسلامی رسومات کے مطابق آپ کو درس قرآن کریم میں بٹھایا گیا۔ آپ نے جلدی قرآن کریم کو حفظ کر لیا۔

آپ کے والد گرامی نے آپ کو مختلف علماء کے پاس دینی علوم کی تعلیم کے لیے بھیجا۔ اگرچہ یہ بات تو پایہ ثبوت تک نہیں پہنچی کہ آپ نے پورا درس نظامی کسی مدرسے میں نہیں پڑھایا۔ تاہم ضروریات دین کے حوالے سے آپ نے متعلقہ علوم میں دسترس حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو درگاہ عالیہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔[1]

ولادت:

پیر کرم شاہ الازہری نانہائی قریشی اور مسلک حنفی ہیں۔ آپ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۳۶ بمطابق یکم جولائی ۱۹۱۸ء شب دوشنبہ بعد از نماز تراویح بھیرہ شریف میں پیدا ہوئے۔[2]

نام:

پیر کھارا کوہستان نمک کے دامن میں ایک گاؤں ہے جو پیر محمد کرم شاہ رحمتہ اللہ علیہ المعروف ٹوپی والے کے فیضان کی وجہ سے مرجع خاص وعام ہے۔ بے پناہ مخلوق اس دربار سے حاضری کے سبب گردہ کی پتھری سے نجات پاتی ہے۔ چونکہ ان بزرگ کے ساتھ آپ کے خانوادہ کے نسبی تعلقات ہیں اس لیے آپ کے جد امجد حضرت پیر امیر شاہ نے انہی کی نسبت سے آپ کا نام محمد کرم شاہ تجویز کیا۔[3]

نسب:

آپ کا نسب اکیس واسطوں سے شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی (رحمتہ اللہ علیہ) سے ہوتا ہوا اصحاب صفہ میں صحابی رسول ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔[4]

کنیت:

آپ کے جد امجد حضرت امیر شاہ نے آپ کا نام محمد کرم شاہ رکھا۔ اور آپ کی کنیت ابوالحسنات آپ کے بڑے صاحبزادے محمد امین الحسنات شاہ کے نام سے مشہور ہوئی۔[5]

---

[1] حافظ احمد بخش، جمال کرم، ضیاء القرآن پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۱، جلد ا ص ۱۶۵

[2] ایضا، ص ۱۶۵

[3] جمال کرم، جلد ا ص ۱۹

[4] ایم احسان الحق صدیقی، مجلہ جمال کرم، (تفسیر ضیاء القرآن) جمال کرم فاؤنڈیشن لاہور ۱۴۲۹، ص ۲۲

[5] جمال کرم، جلد ا، ص ۱۶۶

ابتدائی تعلیم:

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر بھیرہ ضلع سرگودھا سے حاصل کی۔ ۱۹۳۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ہی اپنے والد پیر محمد شاہ غازی کے قائم کردہ دار العلوم محمدیہ غوثیہ میں دینی تعلیم کا آغاز کیا۔ دورۃ حدیث شریف میں مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی کے درس میں شریک ہوئے۔ اور ۱۹۴۳ء میں سند فراغت حاصل کی۔ استاذ محترم نے دستار فضیلت حضرت دیوان صاحب آل رسول اجمیری سے بندھوائی۔

۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۰ء کے عرصہ میں آپ جامعہ ازہر قاہرہ (مصر) تشریف لے گئے۔ جہاں چھ سال کا کورس آپ نے ساڑھے تین سال کے عرصے میں مکمل کیا۔ ۱۹۵۴ء میں جامعہ کی اعلیٰ اسناد الشہادۃ العالمیہ اور رخص القباء حاصل کیا اور امتحان میں جامعہ کے تمام طلباء میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ جامعہ ازھر سے فراغت کے بعد آپ وطن واپس تشریف لائے۔ اور دار لعلوم محمدیہ رضویہ بھیرہ شریف میں تدریس شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے ۱۹۷۰ء میں ماہنامہ ضیائے حرم کا بھی اجراء کیا۔[1]

اساتذہ ومشائخ:

دارالعلوم محمدیہ خوشاب میں جن نامور اساتذہ کرام سے آپ نے اکتساب فیض کیا ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

1۔ مولانا محمد قاسمؒ:

آپ دارالعلوم محمدیہ خوشاب کے جلیل القدر عالمِ دین اور مخلص استاد تھے۔ علمِ حدیث، تفسیر اور فقہ میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ آپ کی تدریس میں اخلاص اور دینی جوش نمایاں تھا۔ پیر کرم شاہ الازہریؒ نے ابتدائی دینی تعلیم میں آپ سے رہنمائی حاصل کی۔

2۔ مولانا محمد دین بدھویؒ:

مولانا محمد دین بدھویؒ علمی وروحانی صفات کے حامل مایہ ناز استاد تھے۔ آپ نے پیر کرم شاہؒ کی فکری بنیاد مضبوط کی اور انہیں قرآن وسنت کے گہرے مطالعے کا ذوق عطا کیا۔ آپ علمِ نحو، صرف اور فقہ میں مہارت رکھتے تھے۔

3۔ مولانا غلام محمودؒ (ساکن پہلاں، ضلع میانوالی):

مولانا غلام محمودؒ زہد وتقویٰ اور اخلاقِ حسنہ کے پیکر تھے۔ آپ فقہ، عربی ادب اور منطق کے ممتاز استاد تھے۔ پیر کرم شاہ الازہریؒ نے ان سے علمی استقامت اور علمی دیانت کا سبق حاصل کیا۔

4۔ شیخ محمد ابو زہرہؒ (جامعہ ازہر، مصر):

شیخ محمد ابو زہرہؒ مصر کے مشہور فقیہ، محدث اور مفکرِ اسلام تھے۔ آپ جامعہ ازہر کے ممتاز اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ فقہ اسلامی، اصولِ فقہ اور جدید مسائل پر آپ کی تصانیف دنیا بھر میں معروف ہیں۔ پیر کرم شاہ الازہریؒ نے مصر میں آپ سے علمی فیض حاصل کیا۔

5۔ محمد مصطفی شلبیؒ (جامعہ ازہر، مصر):

آپ جامعہ ازہر کے جلیل القدر محدث اور مفسر تھے۔ آپ نے حدیث، تفسیر اور عربی زبان وادب میں گہری مہارت حاصل کی تھی۔ پیر کرم شاہؒ نے ازہر میں دورانِ تعلیم ان سے روایتِ حدیث اور عربی فصاحت وبلاغت کی تعلیم حاصل کی۔

---

[1] ایضا، جلد ا، ص ۱۷۰

6۔احمد ذکیؒ (جامعہ ازہر، مصر) :

شیخ احمد ذکیؒ جامعہ ازہر کے ممتاز مفسر، ادیب اور ماہرِ اصولِ دین تھے۔ آپ کا علمی اسلوب متانت اور گہرائی سے بھرپور تھا۔ پیر کرم شاہ الازہریؒ نے ان سے علومِ قرآن، عقائد اور فلسفۂ اسلام کے اہم مضامین میں رہنمائی حاصل کی۔[1]

تحصیل علوم عربیہ و دینیہ مرحلہ وار:

آپ نے مولانا محمد قاسم بالا کوٹیؒ سے جو کتب پڑھیں اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

فارسی: پندنامہ کریما، مصدر فیوض، نام حق

عربی گرائمر: علم صرف کے مختلف رسائل اور علم نحو کافیہ وغیرہ۔

علم منطق کے اساتذہ کرام سے اس علم کی درج ذیل کتب پڑھیں:

ملا حسن، میر زاہد، ملا جلال، حمد اللہ، قاضی مبارک

حضرت غلام محمود صاحب سے درج ذیل کتب پڑھیں:

مختصر المعانی، مطول، مسلم الثبوت، اور ادب میں حماسہ متنبی وغیرھا۔

بیعت:

پیر کرم شاہ المعروف ضیاء الامت نے حضرت خواجہ ضیاء الدین سیالویؒ کے دست مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا۔

علمی احیاء کی تحریک:

آپ مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ آپ کی انتہائی خواہش ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے نہار ہی تعلیم سے آراستہ ہوں۔ ان کے دلوں میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہو اور انھیں اپنے حقوق و فرائض سے آگاہی نصیب ہو۔ آپ نے اپنے والد گرامی کی اجازت سے دربار عالیہ سے متصل ۱۹۲۵ء میں محمدیہ غوثیہ کے نام سے ایک پرائمری سکول قائم کیا۔ اس سکول میں قابل قدر اساتذہ کا انتظام تھا جس کے باعث یہاں سے قابل ترین افراد نے علوم حاصل کیے۔ جنھوں نے مل کر مسلمان قوم کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کرنا تھا۔[2]

تلامذہ:

آپ کے تلامذہ میں تقریباً سارے ہی علمی دنیا سے وابستہ رہے۔ اُن میں چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔سید نذیر حسین شاہ

۲۔ مولانا محمد مختار احمد ضیاء

۳۔سید ظفر علی شاہ

۴۔سید زاہد صدیق شاہ

۵۔امداد حسین

۶۔السید عمر عادل ملا میکی[3]

---

[1] جمال کرم، جلد ا، ص ۱۹۰

[2] مہنامہ ضیاء حرم (ضیاء الامت) ص ۶۰۲

[3] ایضا، جلد ا، ص ۷۰

علمی مقام و مرتبہ:

علم و دانش، زہد و تقوی، تبلیغ اسلام اور اصلاح نفس کے حوالے سے پیر کرم شاہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ اسلام اور اشاعت دین کے تقریبا تمام طرق کو اختیار کرنے اور فروغ دین کو منزل وحید بنانے میں اگر موصوف منفرد نظر نہ آئیں تو کم از کم اس میدان میں ان کی قیادت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔

علوم قدیمہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے بھی مرصع ہونے کے باوجود آپ کی دین سے محبت اور خدمت دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینا جہاں احساس کمتری کے شکار ان لوگوں کے لیے راہ ہدایت ہے جو سکولوں اور کالجوں کی کچھ ہوا کھانے کے بعد پٹڑی سے اتر جاتے ہیں اور دین کے حوالے سے تشخص کو اجاگر کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں وہاں آپ کی زندگی اس خدشے کے ازالہ کے لیے بھی کافی ہے کہ علوم جدیدہ دین سے دوری کا باعث ہیں۔

آپ کی علمی گفتگو میں بھی کبھی خشکی کا پہلو نظر نہیں آیا بلکہ آپ کی گفتگو کے پس منظر میں محبتوں کا ایک جہاں نظر آیا۔ آپ کی تقریر ہو یا تحریر ایسے لگتا ہے کہ جیسے الفاظ کے جامے میں عشق رسول ﷺ کے جام ہیں جو سماعت و بصارت کے ذریعے دلوں کے تہہ خانوں میں اتر رہے ہیں۔[1]

ضیاء الامت اسلام کے عظیم رہبر و رہنما تھے۔ ان کا شمار ہمیشہ اقتدایان علم میں ہوتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صاحب علم و خشیت، صاحب غناء واستغناء، صاحب عبادت و ریاضت اور صاحب سنت بنایا تھا۔ آپ کا ظاہر شریعت محمدی ﷺ سے اور آپ باطن طریقت محمدی ﷺ مسلم سے روشن تھا۔

آپ نے خود اپنی زندگی اور اپنے نظام تعلیم وتربیت کی زندگی ان ستونوں پر استوار کی تھی۔ جس میں قرآن کریم کی تعلیم اور پیغام عام کرکے نہ صرف طالب علم بلکہ ایک ایک شخص کے تعلق کو اللہ تعالی کیساتھ قرآن کریم کے ذریعہ استوار فرمادیا تھا۔ ہر طریق تصوف و طریق زہد اور طریق طریقت کو اپنایا اور تصوف کے ذریعہ تزکیہ اور تصفیہ کے باعث قلب و باطن کے تاریکی کی تربیت کی تاکہ ہمارے دل معارف قرآن جذب کرنے کے قابل ہو جائیں پھر تعلیم و حکمت کی طرف لے کر چلے۔ پھر اسرار معرفت کے دروازے دکھائے۔ آپ کے زندگی اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

پیر محمد کرم شاہ الازہری کی دینی و علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت مصر نے آپ کو تمغہ امتیاز دیا۔ اس سلسلہ میں آپ مارچ ۱۹۹۳ء میں مصر تشریف لے گئے۔ مصر کے صدر حسنی مبارک نے آپ کو تمغہ پیش کیا۔ اس موقع پر ریڈیو قاہرہ نے آپ کا انٹرویو اپنی اردو نشریات کے لیے ریکارڈ کیا۔[2]

تصنیفات:

پیر کرم شاہ مصنف تھے، وہ مفسر قرآن تھے، آپ کی تفسیر ضیاء القرآن اس کا بین ثبوت ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی قرآن و حدیث کے عین مطابق گزاری۔ ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مقالات اور کتب انھیں انیسویں صدی کا بہترین مصنف یاد کرتی ہیں۔ ان کے قلم کی خصوصیات یہ ہے وہ جس عنوان پر بھی لکھتے ہیں اس میں ایسا تسلسل، روانی اور سلاست پیدا کرتے ہیں کہ قاری اس کو پورا پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

---

[1] جمال کرم، ج ا، ص ۳۹۸

[2] ایضا، ج ا، ص ۳۹۸

درس و تدریس اور دیگر مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ تحریک نظام مصطفی ملی ٹیم کے دران جب آپ ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا میں رہے تو تصنیف و تالیف اور وعظ و ارشاد کا سلسلہ یہاں بھی منقطع نہ ہوا۔ آپ نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن کا کچھ حصہ اُس دور میں تالیف کیا۔ بعض سورتوں کے آخر میں آپ کے دستخط اور ایام وقید و بند کی تاریخ دی گئی ہے۔ آپ کی مشہور تصنیفات میں کچھ درج ذیل ہیں:[1]

۱۔ تفسیر ضیاء القرآن: (قرآن کریم کی مکمل تفسیر پانچ جلدوں میں)

۲۔ جمال القرآن: (قرآن کریم کا آسان اور خوبصورت ترجمہ)

۳۔ ضیاء النبی: (۷ جلدوں پر مشتمل سیرت النبی ﷺ پر کتاب)

۴۔ قصید و اطیب النغم: (خوبصورت نعتیہ قصائد)

۵۔ سنت خیر الانام: (فتنہ انکار سنت پر تحقیقی کتاب)

۶۔ مقالات: (مختلف علمی، روحانی اور معاشی موضوعات پر جامع مقالات کا مجموعہ)

۷۔ مجموعہ وظائف مع دلائل الخیرات شریف: (اوراد و وظائف کا مجموعہ)

پیر کرم شاہ کا علمی کمال آپ کو اپنے ہم عصر علماء سے ممتاز کرتا ہے آپ کے اہم رسائل جو آج بھی اُمت مسلمہ کی رہنمائی کرتے ہیں درج ذیل ہیں:

۱۔ دعوت فکر و نظر

۲۔ تحذیر الناس میری نظر میں

۳۔ ضیائے حرم

پیر کرم شاہ الازہری نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ قرآن کریم کی خدمت میں صرف کر کے اُمت مسلمہ کے لیے ایک بیش بہا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ ہر قسم کے مسائل خواہ وہ معاشرتی ہوں یا سیاسی ہوں اقتصادی ہوں یا اخلاقی ان پر سیر حاصل بحث کی ہے اور خصوصی طور پر وہ مسائل جو ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کے درمیان وجہ نزاع ہیں ان کے بارے میں مختلف مقامات پر ایسے مثبت اور مدلل مقالات سپرد قلم کیے ہیں کہ ظن و تشکیک کے اظہار سے آلودہ اذہان ان کو پڑھنے کے بعد آسانی کے ساتھ اپنی فکر کی راہ متعین کر سکیں۔

وفات:

پیر کرم شاہ جملہ منازل کو کامیابی و کامرانی سے طے کرتے ہوئے سب سے پہلے ۱۹۹۵ء میں بیماری کی کیفیت سے دوچار ہوئے، ۲۳ مئی ۱۹۹۵ء سے ۲۷ مئی ۱۹۹۵ء تک اسلام آباد کمپلیکس میں زیر علاج رہے۔ برطانیہ میں مقیم ارادت مندوں کے اصرار پر جون ۱۹۹۵ء میں آپ انگلینڈ تشریف لے گئے وہاں محدود پیمانے پر تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ آپ کے طبی معائنہ کا بھی اہتمام کیا گیا۔[2]

اس بیماری سے تندرستی کے بعد آپ ذوالحج ۱۳۱۸ ہجری بمطابق ۱۸ اپریل ۱۹۹۸ء کو عالم فنا سے عالم بقا کی طرف رحلت فرما گئے۔

---

[1] ایضاً، ج ۱، ص ۳۹۸

[2] ماہنامہ ضیاء حرم (ضیاء الامت) ص ۳۱

تبیان القرآن کے مؤلف کا تعارف

علامہ غلام رسول سعیدی کا تعارف

علامہ رسول سعیدی مشہور مفسر محدث اور فقیہ ہے۔ اللہ تعالی نے آپ کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا آپ کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔[1]

ولادت و جائے پیدائیش

شیخ التفسیر والحدیث علامہ غلام رسول سعیدی 10 رمضان المبارک 1356ء بمطابق 14 نومبر 1937ء کو دہلی انڈیا میں پیدا ہوئے۔[2]

ابتدائی تعلیم

آپ نے چھ سال کی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ سے قرآن مجید ناظرہ مکمل کیا اور دس سال کی عمر میں آپ نے پنجابی اسلامیہ ہائی سکول دہلی سے پرائمری کیا۔ مزید سلسلہ تعلیم جاری تھا کہ برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی۔ چنانچہ آپ انڈیا سے ہجرت کر کے 1947ء میں پاکستان آگئے اور اہل خانہ کے ساتھ شہر کراچی میں اقامت پذیر ہو گئے۔ یہاں مختلف معاشی حوادث و مسائل کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رہ سکی۔ تو آپ نے کمپوزنگ کا کام سیکھا اور تقریبا آٹھ سال تک کراچی کی مختلف اخبارات میں کام کرتے رہے۔[3]

اعلی تعلیم

اعلی تعلیم کے حصول کے لیے آپ جامعہ محمدیہ رحیم یار خان چلے گئے۔ وہاں مولانا محمد نواز اویسی صاحب سے ابتدائی کتب اور ترجمہ قرآن پڑھا۔ اس کے بعد علامہ عبد المجید اویسی صاحب سے فارسی کی بقیہ کتب اور صرف و نحو پڑھی پھر انہی کے ہمراہ سراج العلوم خانپور گئے اور وہاں سے جامعہ نعیمیہ لاہور تشریف لے آئے۔ یہاں مولانا عبد الغفور صاحب سے کافیہ، شرح تہذیب، اصول الشاشی، نور الانوار اور مفتی محمد حسین نعیمی سے شرح جامی، قطبی، جلالین شریف اور بدایۃ الحکمۃ پڑھیں۔ جبکہ تخصیص کے چند اسباق مفتی عزیز احمد بدیوانی سے حاصل کیے۔ پھر آپ بندیال شریف ضلع خوشاب تشریف لے آئے۔ یہاں آگر آپ نے استاذ العلماء علامہ عطا محمد بندیالوی سے کتب منقول و معقول جامع ترمذی، توضیح تلویح، ہدایہ آخیرین، مختصر المعانی، مطول ملا حسن، میبذی، صدر الشمس بازغہ، زواید گلشہ، قاضی مبارک، حمد اللہ، خیالی اور مسلم الثبوت وغیرہ پڑھیں۔ اخیر میں آپ جامعہ قادریہ، فیصل آباد تشریف لے گئے جہاں آپ نے مولانا ولی النبی سے اقلیدس اور تصریح پڑھیں۔[4]

تدریس

1966ء میں علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کرنے کے بعد اسی سال جامعہ نعیمیہ لاہور میں تدریس شروع کی۔ چار سال تک آپ مختلف

---

[1] ڈاکٹر عاطف اسلام راؤ، علامہ غلام رسول سعیدی کی علمی خدمات، مجلہ الثقافۃ الاسلامیہ، ۲۰۱۸ ص ۱۶۳

[2] ایضا، ص ۱۶۳

[3] ایضا، ص ۱۶۳

[4] ایضا، ص ۱۶۳

علوم و فنون کی کتابیں پڑھاتے رہے اور 1970ء سے دورہ حدیث شریف پڑھانا شروع کیا۔ 1978ء میں مفتی سید شجاعت علی قادری کی دعوت پر آپ کراچی تشریف لائے اور ایک سال تک دارالعلوم نعیمیہ کراچی میں حدیث شریف کے اسباق پڑھاتے رہے بعد ازاں مفتی محمد حسین نعیمی کی خواہش پر دوبارہ جامعہ نعیمیہ لاہور چلے گئے۔ 1983ء میں آپ کو کمر کی تکلیف اور شوگر کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ جس کی وجہ سے نیچے بیٹھ کر پڑھانا دشوار ہو گیا۔ سو مفتی سید شجاعت علی قادری کے بے حد اصرار پر 1985ء میں دوبارہ کراچی تشریف لے آئے اور بحیثیت شیخ الحدیث کے دارالعلوم نعیمیہ کراچی میں رونق افروز ہوئے۔ اور تادم آخر یہیں اقامت پذیر رہے۔[1]

تصانیف

علامہ غلام رسول سعیدی کا نام جس طرح فن تدریس میں نمایاں ہے اسی طرح تصنیف و تحریر میں بھی آپ کا نام روشن اور بلند مقام کا حامل ہے۔ آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

1. تفسیر تبیان القرآن
2. شرح صحیح مسلم
3. تذکرۃ المحدثین
4. توضیح البیان
5. مقالات سعیدی
6. مقام ولایت
7. ذکر بالجہر
8. حیات استاذ العلماء
9. ضیاء کنز الایمان
10. فاضل بریلی کا فقہی مقام[2]

بیعت

1956ء میں غزالی زمان رازی، دوران علامہ سید احمد سعید کاظمی کے دست اقدس پر آپ نے بیعت کی سعادت حاصل کی۔

رکن اسلامی نظریاتی کونسل

آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ فروری 1997ء میں آپ رکن منتخب ہوئے اور مقررہ معیاد کے مطابق 1999ء تک اس کے رکن رہے اور نامور عالم دین اور محقق ہونے کی حیثیت سے مسلک اہلسنت کی نمائندگی فرمائی۔ علامہ غلام رسول سعیدی کے معتقدین و محبین کا ایک وسیع حلقہ یورپ و امریکا میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ آپ کئی مرتبہ برطانیہ کے تبلیغی دورے پر تشریف لے گئے۔ پہلی بار 1990ء میں گئے اور تین ماہ تک برطانیہ کے مختلف شہروں لندن، مانچسٹر، بریڈفورڈ، برمنگھم اور برسٹل وغیرہ میں دینی اجتماعات سے خطاب کیا۔ مختلف مقامات پر لیکچرز دیے اور مختلف مساجد میں جمعتہ المبارک کے اجتماع سے خطاب فرمائے۔ 20 دسمبر 1990ء کو واپسی پر زیارت حرمین شریفین کی سعادت بھی حاصل کی۔ 1992ء میں آپ دوبارہ برطانیہ تشریف لے گئے اور دو ماہ تک قیام فرمایا۔ اس میں بھی

[1] علامہ غلام رسول سعیدی کی علمی خدمات، ص ۱۶۳

[2] ربیعہ ریاض، تفسیر فتح المنان اور تفسیر تبیان القرآن میں مباحث علوم القرآن کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم فل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ص ۷

مختلف اجتماعات سے خطابات فرمائے۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ نے دونوں تبلیغی دوروں میں اپنے شرح صحیح مسلم کا کام بھی جاری رکھا۔ چنانچہ پہلے دورے میں کتاب اللباس الزینہ " کے 142 ابواب کی شرح تحریر فرمائی اور دوسرے دورے میں کتاب الطہارۃ کے 13 ابواب کی شرح فرمائی۔[1]

حج اکبر کی سعادت

شرح صحیح مسلم، جلد ثالث میں علامہ صاحب نے تحقیق سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ جس سال یوم عرفہ جمعہ کے دن ہو اس سال کا حج، حج اکبر ہوتا ہے۔ اس حج کا ثواب ستر (70) حج سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ نیز رسول اللہ اللہ علیہ وسلم نے جس سال حج فرمایا تھا۔ اس سال یوم عرفہ جمعہ کے دن تھا۔[2] اللہ تعالی نے اپنے حبیب ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے آپ کو بھی حج اکبر کی سعادت سے بہرہ ور فرمایا اور 1994ء میں آپ حج اکبر کی سعادت عظمی سے مشرف ہوئے۔[3]

---

[1] تبیان القرآن ج ا ص ۷۱

[2] علامہ غلام رسول سعیدی، شرح صحیح مسلم، فرید بک سٹال، اردو بازار لاہور، جلد ۳ ص ۶۸۹

[3] شرح صحیح مسلم، فرید بک سٹال، اردو بازار لاہور ص ۱۲

فصل چہارم: منتخب تفاسیر کا تعارف

معارف القرآن کا تعارف

معارف القرآن آسان، عام فہم اور دلنشین تفسیر ہے۔ یہ تفسیر آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ معارف القرآن دراصل دروس کا مجموعہ ہے، جو ریڈیو پر نشر ہوتے تھے۔ مفتی محمد شفیع عثمانی اپنی تفسیر کے مقدمے میں لکھتے ہیں

"بنام خدا تعالی یہ درس بنام معارف القرآن 3 شوال 1373ء، 2 جولائی 1954ء سے شروع ہوا اور گیارہ سال تقریباً پابندی سے جاری رہا یہاں تک کہ جون 1964ء میں ریڈیو پاکستان کی اپنی نئی پالیسی کے تحت اس درس کو ختم کر دیا گیا، یہ درس معارف القرآن تیرہویں پارے اور سورہ ابراہیم پر ختم ہو گیا جس میں ان تیرہ پاروں کی تفسیر نہیں بلکہ منتخب آیات کی تفسیر تھی۔۔۔۔ مگر ہوا یہ کہ جب یہ درس نشر ہو نا شروع ہوا تو پاکستان کے سب علاقوں سے اور ان سے زیادہ غیر ممالک افریقہ، یورپ وغیرہ میں رہنے والے مسلمانوں کی طرف سے بے شمار خطوط پاکستان خود احقر کو موصول ہوئے۔ جگہ جگہ سے اس کا تقاضہ ہوا کہ درس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔[1]

"معارفُ القرآن "دراصل "بیانُ القرآن" کی تسہیل ہے۔ زمانۂ دراز سے ایک تمنا دل میں تھی کہ حکیمُ الاُمّت، مجدّدُ الملّت، سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر "بیانُ القرآن" جو ایک بے نظیر، مختصر مگر جامع تفسیر اور سلفِ صالحین کی تفسیروں کا نچوڑ ہے کو عام فہم انداز میں پیش کیا جائے، کیونکہ وہ علمی زبان اور اصطلاحات میں لکھی گئی ہے جن سے آج کل کے عوام استفادہ کرنے سے قاصر ہیں۔ معارفُ القرآن نے یہ دیرینہ تمنا پوری کر دی ہے۔

اس میں سب سے پہلے شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، جس کے بعد خلاصۂ تفسیر کے عنوان سے بیانُ القرآن کے مضامین کو عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر معارف و مسائل کے تحت قرآنی آیات کی توضیح کی گئی ہے، اور فقہی نکات کو احکام و مسائل کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ تفسیر نہ صرف بیانُ القرآن کی تشریح ہے بلکہ عصرِ حاضر کی ضروریاتِ زندگی کے حوالے سے قرآنِ کریم کی ہدایات کی جامع وضاحت بھی کرتی ہے۔ اس میں جدید تہذیب کے پیدا کردہ فکری و عملی مسائل پر قرآنی فکر کی روشنی میں نہایت متوازن تبصرہ کیا گیا ہے۔[2] معارفُ القرآن کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ قدیم و جدید علوم کا حسین امتزاج ہے۔ مصنف نے علمی گہرائی کے ساتھ ساتھ سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی، تاکہ اہلِ علم کے ساتھ عام قاری بھی قرآنِ کریم کے مفاہیم سے بہرہ مند ہو سکے۔

معارف القرآن کا منہج

تفسیر القرآن بالقرآن

قرآن تفسیر کا سب سے پہلا ماخذ ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن میں ایک جگہ کوئی مضمون اجمالاً بیان کیا، دوسری جگہ اس مضمون کی تفصیل بیان کر دی ہے۔[3]

---

[1] محمد شفیع عثمانی، معارف القرآن، ادارہ المعارف کراچی، ۲۰۰۸، ج ۱، ص ۶۹

[2] عثمانی، محمد تقی، علوم القرآن، کراچی: مکتبہ دارالعلوم، ۱۴۱۵ھ / ۱۹۹۵ء

[3] معارف القرآن، ج ۱، ص ۸۴

تفسیر القرآن بالحدیث

حدیث تفسیر کا دوسرا ماخذ ہے۔ آپ میلی لی ایم کا قول، فعل اور تقریر قرآن کی تشریح ہے۔[1]

تفسیر القرآن باقوال الصحابۃ والتابعین

صحابہ اور تابعین کے اقوال تفسیر کا تیسرا بڑا ماخذ ہے۔۔[2]

لغوی مباحث

قرآن پاک عربی زبان میں ہے۔ معارف القرآن میں ہر آیت کی تفسیر سے پہلے آسان اور سلیس ترجمہ کرتے ہیں۔ ضرورت کی حد تک لغوی مباحث ذکر کرتے ہیں۔ صرفی اور نحوی تحقیق کے ساتھ آیت کے مختلف معانی وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ سورہ فاتحہ کی پہلی آیت کی تفسیر میں جداجد الغوی معنی بیان کرتے ہیں۔ لفظ رب کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے یہاں تک کہ وہ حد کمال کو پہنچ جائے، یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لئے مخصوص ہے کسی مخلوق کو بدون اضافت کے رب کہنا جائز نہیں کیونکہ ہر مخلوق خود محتاج تربیت ہے وہ کسی دوسرے کی کیا تربیت کر سکتا ہے، العلمین عالم کی جمع ہے جس میں دنیا کی تمام اجناس آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا و فضاء برق و باران، فرشتے جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات حیوانات، انسان نباتات، جمادات سب ہی داخل ہیں اس لئے رب العلمین کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالی تمام اجناس کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے جس میں ہم بستے ہیں اور اس کے نظام شمسی و قمری اور برق و باراں اور زمین کی لاکھوں مخلوقات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں یہ سارا ایک ہی عالم ہو اور اسی جیسے اور ہزاروں لاکھوں دوسرے عالم ہوں جو اس عالم سے باہر کی خلا میں موجود ہوں امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلاء کا وجود دلائل عقلیہ سے ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ اس نے اس لامتناہی خلاء میں ہمارے پیش نظر عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں لاکھوں عالم بنا رکھے ہوں۔[3]

۲۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّینِ[4] لفظ مالک ملک سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز پر ایسا قبضہ کہ وہ اس میں تصرف کرنے کی جائز قدرت رکھتا ہو (قاموس) لفظ دین کے معنی جزاء دینا۔ ملک یوم الدین کا لفظی ترجمہ ہوا مالک روز جزاء کا یعنی روز جزاء میں ملکیت رکھنے والا[5] إِیَّاکَ نَعْبُدُ وَإِیَّاکَ نَسْتَعِینُ[6] اس آیت میں ایک پہلو حمد و ثناء کا اور دوسرا دعاء و درخواست کا ہے، تعبد عبادت سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کی انتہائی تعظیم و محبت کی وجہ سے اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی اور فرمانبرداری کا اظہار اور نستعین استعانت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کسی سے مدد مانگنا آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔[7]

---

[1] معارف القرآن، محولہ بالا، ج ۱، ص ۹۳

[2] معارف القرآن، ج ۱، ص ۸۱

[3] معارف القرآن، مفتی محمد شفیع عثمانی، ادارۃ المعارف کراچی، طبع جدید ربیع الثانی ۱۴۲۹، اپریل ۲۰۰۸، جلد اول ص ۸۰

[4] الفاتحہ ۱:۳

[5] معارف القرآن، ج ۱، ص ۸۳

[6] سورۃ الفاتحہ ۱:۴

[7] معارف القرآن، ج ۱، ص ۸۴

کلامی مباحث

علم الکلام عقائد سے متعلق علم ہے۔ چیدہ چیدہ مقامات پر علم الکلام سے بحث کی گئی ہے۔

۱۔ اچھائی اور برائی دونوں کو اللہ کی ذات پیدا کرنے والی ہے۔ معتزلہ اور اہلسنت کے درمیان ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ مفسر نے خوبصورتی کے ساتھ عام آدمی کی فہم کے مطابق ذکر کیا ہے۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اچھا یا برا کام ایمان یا کفر اللہ تعالی کی مشیت یا ارادہ کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لئے ہر چیز کے وجود میں آنے کے لئے اللہ جل شانہ کا ارادہ فرماہے۔ البتہ رضا اور پسندیدگی حق تعالیٰ کی صرف ایمان اور اچھے کاموں سے متعلق ہوتی ہے۔ کفر و شرک اور معاصی اس کو پسند نہیں۔[1]

۲۔ انبیاء کے بعد صحابہ کا مرتبہ ہے۔ مشاجرات صحابہ کے بارے میں اعتدال پر مبنی بات ذکر کرتے ہیں۔ تمام صحابہ کرام کی تعظیم و تکریم، ان سے محبت کرنا، ان کی مدح و ثنا کرنا واجب ہے اور ان کے آپس میں جو اختلافات اور مشاجرات پیش آئے ان کے معاملے میں سکوت کرنا، کسی کو مورد الزام نہ بنانا لازم ہے۔ عقائد کی تمام کتابوں میں اس اجماعی عقیدہ کی تصریحات موجود ہیں۔[2]

مضامین سورۃ

ہر سورت کے شروع میں مضامین ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ سورت فاتحہ کے مضامین کا آیات کے اعتبار سے جائزہ لیتے ہیں۔ سورت فاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے، جن میں پہلی تین آیات میں اللہ تعالی کی حمد و ثناء ہے، اور آخری تین آیات میں انسان کی طرف سے دعاء و درخواست کا مضمون ہے، جو رب العزت نے اپنی رحمت سے خود ہی انسان کو سکھایا ہے، اور درمیانی ایک آیت میں دونوں چیزیں مشترک ہیں، کچھ حمد و ثناء کا پہلو ہے کچھ دعاء و درخواست کا۔[3]

۲۔ سورہ بقرۃ کے مضامین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ اس سورت میں اول ایمان کے بنیادی اصول توحید، رسالت، آخرت اجمالی طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبہ زندگی: عبادات معاملات، معاشرت، اخلاق، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدآیات کے بنیادی اصول اور ان کے ساتھ بہت سی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔[4]

فضائل سورۃ

ہر سورت کے شروع میں فضائل، خصوصیات اور مختلف نام ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالی نے فرمایا ہے کہ نماز یعنی سورہ فاتحہ میرے اور بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے اور جو کچھ میرا بندہ مانگتا ہے وہ اس کو دیا جائے گا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب کہتا ہے **الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَلَمِينَ** تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی ہے اور جب وہ کہتا ہے **الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ** تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف و ثناء بیان کیا ہے اور جب بندہ کہتا ہے **مالک یوم الدین** تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے اور جب بندہ کہتا ہے **إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ** تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے کیونکہ اس میں ایک

---

[1] معارف القرآن، ج۱، ص۱۰۴

[2] ایضاجلد ۱، ص۳۰۰تا۳۰۲

[3] معارف القرآن، ج۱، ص۷۹

[4] ایضا، ص۱۰۴

پہلو حق تعالی کی حمد و شاہ کا ہے اور دوسرا پہلو بندے کی دعاء و درخواست کا اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ میرے بندے کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی پھر جب بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ تو حق تعالی فرہتا ہے کہ یہ سب میرے بندے کے لئے ہے اور اس کو وہ چیز ملے گی جو اس نے مانگی "[1]

فقہی تفسیر

معارف القرآن فقہی تفسیر ہے۔ قرآن پاک کی پانچ سو آیات کا تعلق احکام سے ہے۔ زیر نظر تفسیر کی اہم خصوصیت روز مرہ زندگی سے متعلق احکام و مسائل کے بیان کا اہتمام و التزام ہے۔

۱۔ نماز میں لباس کے متعلق چند مسائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ستر جس کا چھپانا انسان پر ہر حال میں اور خصوصا نماز و طواف میں فرض ہے۔ اس کی حد کیا ہے؟ قرآن کریم نے اجمالا ستر پوشی کا حکم دے کر اس کی تفصیلات کو نبی کریم ﷺ کے حوالہ کیا آپ نے تفصیل کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک اور عورت کا ستر سارا بدن صرف چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں اور قدم مستثنی ہیں۔ [2]

۲۔ سفر میں قصر کے حوالے سے ائمہ اربعہ کے اقوال بیان کرتے ہیں۔ تعیین کے بغیر حنفی فقہ کی دلیل بیان کرتے ہوئے ترجیح دیتے ہیں۔ اب یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سفر میں قصر کرنا واجب ہے یا مستحب۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک اسے وجوب کا درجہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قصر نہ کرنے والا مسافر گناہ گار ہو گا۔ البتہ امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ مستحب ہے۔ گویا سفر میں قصر کرنا افضل ہے۔ اگر پوری نماز پڑھ لے تو گناہ گار نہیں ہو گا۔ حضرت عمرؓ کی روایت میں آتا ہے کہ قصر کرنا **صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته** یہ اللہ تعالی کی طرف سے صدقہ ہے، اس صدقہ کو قبول کرنا چاہیے اور آدھی نماز پڑھنا چاہیے۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت یعلی ابن امیہ نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں قصر کا حکم صرف خوف کی حالت میں ہے جب کہ حضور ﷺ نے امن کی حالت میں بھی قصر نماز پڑھی، فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کو پورے عرب میں غلبہ حاصل ہو گیا تھا مگر آپ نے دو سال بعد یعنی حجۃ الوداع کے موقع پر بھی نماز دو رکعت ہی ادا فرمائی اس کے جواب میں حضرت عمر نے کہا بھائی! میں نے بھی حضور ﷺ سے سنا ہے کہ بظاہر یہ آیت خوف کی حالت کے متعلق ہی ہے مگر در حقیقت یہ اللہ تعالی کی جانب سے معافی اور صدقہ ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ صدقہ ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے ایک دفعہ دے کر اسے واپس نہیں لیا جاتا کہ یہ ایک کمینی حرکت ہے۔ اللہ تعالی تو سب کریموں کا کریم ہے لہذا اس کی طرف سے سفر میں دو رکعت کی معافی کا صدقہ قبول کرنا چاہیے۔[3]

عصر حاضر کے مسائل

۱۔ زمانہ تغیر پذیر ہے۔ ہر بدلتے لمحے نت نئی ایجادات ہو رہی ہیں۔ نماز میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال کا شرعی حکم بیان کرتے ہیں۔ آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کی آواز پر نماز میں نقل و حرکت کے مفسد نماز نہ ہونے پر استدلال: صحیح بخاری باب ماجاء فی القبلہ میں حضرت عبد

---

[1] مسلم بن مسلم بن حجاج القشیری، صحیح مسلم کتاب الصلوۃ، باب وجوب القراءۃ فی کل رکعۃ، ح ۳۹۵

[2] معارف القرآن، جلد ۳ ص ۵۴۳

[3] معارف القرآن، ج ۲، ص ۵۳۲

اللہ بن عمر کی حدیث میں جو قباء میں تحویل قبلہ کا حکم پہنچنے اور ان لوگوں کے بحالت نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا اس پر علامہ عینی حنفی نے تحریر فرمایا ہے، **فیہ جواز تعلیم من لیس فی الصلوۃ من ھو فیھا** [1]

یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے کو تعلیم و تلقین کر سکتا ہے۔ یہ کلام اس بنیاد پر ہے کہ آلہ مکبر الصوت کی آواز کو عین امام کی آواز نہ مانی جائے بلکہ اس کی نقل وحکایت قرار دیا جائے اور اہل فن اس کی آواز کو عین آواز امام کہتے ہیں ان کی تحقیق پر تو کوئی اشکال جواز صلوۃ میں نہیں ہے اس مسئلہ کی تحقیق پر احقر کا ایک مستقل مفصل رسالہ بھی شائع شدہ ہے اس کو دیکھ لیا جائے واللہ سبحانہ و تعالی اعلم۔ [2]

۲۔ استیذان کے عنوان کے تحت ٹیلیفون سے متعلق بعض مسائل ذکر کرتے ہیں۔ مسئلہ: کسی شخص کو ایسے وقت ٹیلیفون کرنا جو عادۃ اس کے سونے یا دوسری ضروریات میں یا نماز میں مشغول ہونے کا وقت ہو بلاضرورت شدید جائز نہیں کیونکہ اس میں وہی ایذا رسانی ہے۔ جو کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے اور اس کی آزادی میں خلل ڈالنے سے ہوتی ہے۔ [3]

اقتصادی مباحث

علم اقتصاد انسان کی مادی ضرورت ہے۔ قرآن کی سب سے بڑی آیت کا موضوع اقتصادیات ہے۔

قرض اور ادھار کے لئے اقرار نامہ لکھنے کی ہدایت اور متعلقہ احکام:

آیات مذکورہ میں قانون معاملات جن کو آجکل کے قانون میں معاہدات کہا جاتا ہے اس کے اہم اصول کا بیان ہے اور اس کے بعد ضابطہ شہادت کے خاص اصول کا ذکر ہے۔ آج کل تو زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے اور تحریر ہی انسان کی زبان کی قائم مقام بن گئی ہے لیکن آپ چودہ سو سال پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھئے تو اس وقت دنیا کا سب کاروبار صرف زبانی ہوتا تھا لکھنے لکھانے اور دستاویز مہیا کرنے کا اصول نہ تھا سب سے پہلے قرآن نے اس طرف توجہ دلائی اور فرمایا:

إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ [4]

یعنی جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کیا کرو کسی معین مدت کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو۔

اس میں ایک اصول تو یہ بتلا دیا کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہیے تا کہ بھول چوک یا انکار کے وقت کام آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ بیان فرمایا گیا کہ ادھار کا معاملہ جب کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے غیر معین مدت کے لئے ادھار دینا لینا جائز نہیں کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ میعاد بھی ایسی مقرر ہونا چاہیے جس میں کوئی ابہام نہ ہو مہینہ اور تاریخ کے ساتھ معین کی جائے کوئی مبہم میعاد نہ رکھیں، جیسے کھیتی کٹنے کے وقت کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہو سکتا ہے اور چونکہ لکھنا اس زمانے میں عام نہ تھا اور آج بھی عام ہونے کے بعد دنیا کی بیشتر آبادی وہی ہے جو لکھنا نہیں جانتی تو یہ ممکن تھا کہ لکھنے والا کچھ کا کچھ لکھ دے جس سے کسی کا نفع اور کسی کا نقصان ہو جائے اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ [5]

---

[1] بدر الدین العینی، عمدۃ القاری شرح بخاری، مکتبہ مدینہ لاہور، ج۴، ص۱۴۸

[2] ایضا جلد ۶، ص۷۷ ۳:۷۹ ۳

[3] معارف القرآن، ج۶، ص ۳۹۲

[4] سورۃ بقرہ ۲۸۲:۲

[5] سورۃ بقرہ ۲۸۲:۲

یعنی یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

اس میں ایک تو اس طرف ہدایت کی گئی کہ کاتب کسی فریق کا مخصوص آدمی نہ ہو بلکہ غیر جانبدار ہو تا کہ کسی کو شبہ اور خلجان نہ رہے، دوسرے کاتب کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ لکھے دوسرے کے فانی نفع کے لئے اپنا دائمی نقصان نہ کرے اس کے بعد کاتب کو اس کی ہدایت کی گئی کہ اللہ تعالی نے اس کو یہ ہنر دیا ہے کہ وہ لکھ سکتا ہے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

اس کے بعد یہ بتلایا گیا کہ دستاویز کی کتابت کس کی طرف سے ہو تو فرمایا:

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ[1]

یعنی لکھوادے وہ آدمی جس کے ذمہ حق ہے مثلاً سوداخریدا اور قیمت کا ادھار کیا تو جس کے ذمہ ادھار ہے وہ دستاویز کا مضمون لکھوادے کیونکہ یہ اس کی طرف سے اقرار نامہ ہو گا، اور لکھوانے میں بھی یہ احتمال تھا کہ کوئی کمی بیشی کر دے اس لئے فرمایا:

وَلْيَتَّقِ اللهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْا[2]

یعنی اللہ تعالی سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے اور حق کے لکھوانے میں ذرہ برابر کمی نہ کرے معاملات میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص پر حق عائد ہو وہ خفیف العقل یا سٹھیا ہوا بوڑھا یا نابالغ بچہ یا گونگا ہو یا کوئی دوسری زبان بولنے والا ہو جس کو کاتب نہیں سمجھتا اس لئے دستاویز لکھوانے پر اس کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے اس کے بعد فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آئے تو ان کی طرف سے ان کا ولی لکھوادے مجنون اور نابالغ کی طرف سے تو ولی کا ہونا ظاہر ہے کہ ان کے سارے معاملات ولی ہی کی معرفت ہوا کرتے ہیں اور گونگے یا دوسری زبان بولنے والے کا ولی بھی یہ کام کر سکتا ہے اور اگر وہ کسی کو اپنا وکیل بنادے تو بھی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں اس جگہ لفظ ولی دونوں معنی پر حاوی ہے۔[3]

سیاسی مباحث

سیاست اسلام کا نقطہ عروج ہے۔ قرآن نے اصول سیاسیات کو بیان کیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے ارباب اقتدار کے لیے فقہی احکام بیان کرتے ہیں۔

۱۔ عوام کے حقوق کا تحفظ کرنے والے لوگوں کی اجرت کا فقہی حکم بیان کرتے ہیں۔ خلیفہ وقت یا سلطان کو جو اپنا پورا وقت امور سلطنت کی انجام دہی میں صرف کرتا ہے شرعا یہ جائز ہے کہ اپنا متوسط گزارہ بیت المال سے لے لے، لیکن کوئی دوسری صورت گزارہ کی ہو سکے تو وہ زیادہ پسند ہے۔[4]

۲۔ عوام پر ارباب اقتدار کی اطاعت لازمی ہے۔ قرآن کی روشنی میں حدود و قیود ذکر کرتے ہیں اگر تم لوگوں کے درمیان کوئی فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ کرو۔ اور اس سے پہلے اللہ تعالی نے لوگوں کو اولی الامر کی اطاعت کی تعلیم دی۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ امیر اگر عدل پر قائم ہے تو اس کی اطاعت واجب ہے اور اگر وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر خلاف شرع احکام صادر کرے تو ان میں امیر کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔[5]

---

[1] سورۃ بقر ۲:۲۸۲

[2] سورۃ بقر ۲:۲۸۲

[3] معارف القرآن، ج ۱، ص ۶۸۲ تا ۶۸۳

[4] ایضا جلد ۷ ص ۲۶۳

[5] معارف القرآن، ج ۲، ص ۴۵۶

معاشرتی مباحث

انسان معاشرتی حیوان ہے۔ معاشرہ انسان کی ناگزیر ضرورت ہے۔

۱۔ گفتگو کا آغاز سلام سے ہوتا ہے۔ مسئلہ: مسلمانوں کے باہم ایک دوسرے کا تحیہ السلام علیکم ہونا چاہئے خواہ بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کے لیے ہو یا چھوٹے کی طرف سے بڑے کے لیے ہو۔[1]

۲۔ خط آدھی ملاقات ہے۔ خط کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنا سنت انبیاء ہے۔ رسالہ میں کر کے تمام مکاتب اس پر شاہد ہیں کہ بسم اللہ کو سب سے مقدم، اس کے بعد کاتب کا نام پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جائے۔

ضیاء القرآن کا تعارف

تعارف

تجدید احیاء علوم دین کے سلسلہ میں محسن ملک وملت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ کا سب سے عظیم کارنامہ تفسیر ضیاء القرآن ہے۔ شاہ صاحب اپنی تفسیر کے بارے میں خود فرماتے ہیں۔

خدا شاہد ہے کہ کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مجھے یہ کام کرنا ہے یا میں یہ کام کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ یا میرے قلم میں اتنا زور ہے کہ میری نگارشات قرآن ہی کے راستے سے ساری رکاوٹیں دور کر سکتی ہیں ان تمام کوتاہیوں کا پورا احساس ہوتے ہوئے یہ کچھ ہو گیا۔

پیر کرم شاہ صاحب کا ہر مقالہ، ہر تصنیف اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔ لیکن قرآن کریم کی تفسیر ضیاء القرآن اُن کے قلم کے شاہکار ہیں۔ اس صدی کا بہترین علمی ذخیرہ ہے۔ اور علم کا سرچشمہ ہے۔ دعوت عمل کا موثر ذریعہ ہے۔ علماء اور عوام کے لیے یکساں مفید ہے۔ غرضیکہ یہ تفسیر ادب رسالت من اللہ سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ تاریک دلوں کو پر ضیاء، پر نور کا اثر رکھتی ہے۔[2]

ا۔ سبب تالیف:

ضیاء القرآن کے سلسلہ میں کام کا آغاز کا فوری سبب یہ بنا کہ چوہدری غلام رسول صاحب (پبلشرز اُردو بازار لاہور) نے آپ سے ملاقات کی اور عرض کی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کی دولت سے نوازا ہے۔ آپ قرآن کریم کی تفسیر لکھیں۔ ہماری کمپنی اس تفسیر کو بہترین انداز میں شائع کرنے کا اہتمام کرے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ نہایت اہم اور مشکل کام ہے۔ آپ مجھے اپنے احباب سے مشاورت کرنے کا کچھ وقت دیں۔ آپ نے اپنے قریبی دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد ابتدائی طور پر یہ طے فرمایا کہ اپنے حتمی فیصلے سے پہلے سورہ البقرہ کے کچھ حصے لکھ کر علماء کرام سے مشورہ کیا جائے اگر جید علماء کرام اس کی تائید فرمائیں تو اس عظیم مشن کا باقاعدہ آغاز کر دیا جائے گا۔ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو اللہ تعالی نے آپ کا انشراح صدور فرمایا اور آپ نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نہایت احسن انداز میں یہ کام شروع کیا۔[3]

---

[1] ایضا، معارف القرآن جلد ۷ ص ۱۷۶

[2] ضیاء القرآن، جلد ۱، ص ۱۰

[3] ایضا، ص ۱۱

۲۔ اسلوب تالیف:

تفسیر ضیاء القرآن کی ابتداء میں ضیاء القرآن کے نام سے مقدمہ پیش کیا گیا۔ اور اس مقدمہ میں ضیاء القرآن کے تیری صحیح کا جائزہ پیش کیا گیا۔ جمع و تدوین اور قرآن کے مختلف ادوار پر بھی روشنی ڈالی گئی اور ساتھ ہی قرات کے اختلاف کی نوعیت کو بھی واضح کیا گیا۔ ترتیب قرآن کے حوالے سے پیر کرم شاہ صاحب نے یہ موقف پیش کیا ہے کہ قرآن عہد رسالت میں ہی مکمل طور پر مرتب کر دیا گیا تھا۔ عبارت فہی کے لیے رموز و اوقاف نہایت اہم ہیں اس لیے مقدمہ میں ۱۱۱۴ ہم رموز و اوقاف بیان کر دیئے گئے ہیں۔ مقدمہ سے پہلی جلد کے آغاز و اختتام کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ کم و بیش پانچ سال کی شب و روز محنت کا نتیجہ ہے کہ یہ چھٹی جلد منظر عام پر آئی۔[1]

ضیاء القرآن کی ہر جلد میں مضامین قرآن کی توضیح کے لیے نقشوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ہر سورت سے پہلے اس کا تعارف لکھا گیا ہے ۔ جس میں سورہ مبارکہ کا نام آیات و رکوع کی تعداد، شان نزول سورتوں کے مکی اور مدنی ہونے کی بحث نیز سورتوں کے مضامین پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اگر کسی سورت میں کوئی اہم تاریخی واقعہ بیان ہوا ہے تو اس کا پس منظر نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔[2]

تفسیر ضیاء القرآن کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات اہمیت کے حامل ہیں:

ا۔ محبت رسول:

قرآن کے قاری کو ضیاء القرآن کے ہر لفظ سے محبت رسول ﷺ کے چشمے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ تفسیر قرآن کو آنسوؤں کا نذرانہ دیئے بغیر پڑھا ہی نہیں جا سکتا۔

۲۔ اختصار و جامعیت:

ضیاء القرآن متداول اردو تفاسیر معارف القرآن تفہیم القرآن، تدبر القرآن، تبیان القرآن سے علمیت میں کم مگر کیفیت میں زیادہ نظر آئے گی گویا پیر کرم شاہ صاحب نے فنی مباحث میں اُلجھے بغیر قرآن کے سمجھنے والے کو قرآن کے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔

۳۔ لغوی و نحوی تحقیقات:

پیر صاحب خود فرماتے ہیں کہ جہاں کوئی لغوی نحوی یا صرفی اُلجھن معلوم ہوئی یا مجھے کوئی پیچیدگی معلوم ہوئی تو میں نے کوشش کی کہ ائمہ فن کے مستند اقوال سے اس کا حل پیش کروں تا کہ دل میں کوئی خلش باقی نہ رہے۔[3]

اس تفسیر میں طلبہ مفردات راغب، قاموس، لسان العرب اور المحیط جیسی غنیم کلفات کی ورق گردانی سے بچ گئے اور اس حقیقت سے آشنا ہوئے کہ لغات میں دیئے گئے معانی میں کون سے مفہوم قرآنی اسلوب کے مطابق ہے۔

۴۔ تصوف کی چاشنی:

صوفیاء کے حوالے سے قرآن کریم کی بعض آیات کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ قرآن کریم کے ظاہری علوم پر بھی کوئی حرف نہ آئے اور معنی بھی تبدیل نہ ہو۔ ہر شخص اس حقیقت کو پرکھ سکتا ہے کہ پوری تفسیر میں پیر کرم شاہ صاحب نے میں بھی اپنی علمی رعب و دبدبہ کھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ بجز و انکساری کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے تفسیر کو مکمل کیا۔

---

[1] ہمایون عباس شمس، ضیاء تعارف، منہج و اسلوب، در مشمولہ مہ نامہ ضیاء حرم ضیاء الامت ملخص، ص ۴۱۰

[2] ضیائے حرم، لاہور، شمارہ اپریل ۲۰۰۲

[3] ضیائے حرم، لاہور، ۱۹۹۹، ص ۱۷۹

۵۔ اہل سنت کے موقف کی وضاحت:

قدیم و جدید گمراہیوں نے آپ نے گمراہ کن نظریات کی ترویج کے لیے جہاں قرآن کا سہارا لیا ان مقامات پر پیر صاحب نے اپنے موقف کو دوٹوک الفاظ میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔

۶۔ ادبی پہلو:

تفسیر ضیاء القرآن فقط دینی ادب میں ایک اضافہ ہی نہیں بلکہ اس تفسیر سے ایک عرصہ بعد اُردو ادب کو بھی ایک صاحب طرز ادیب ملا۔ اس ادبی پہلو میں ابلاغی حوالہ سے ایک اہم مقام ہے کہ آپ نے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے حسن اداء کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کا ساتھ عمدہ الفاظ کا استعمال، زور بیاں اور دعوت عمل میں تاثیر آپ کی تحریر کا حصہ ہیں۔

۷۔ قرآن کریم اور جدید سائنسی تحقیقات کے حوالے سے اسلوب:

جدید تعلیم یافتہ طبقہ قرآنی نظریات کو سائنس کے تناظر میں دیکھنے کا عادی ہے۔ پیر صاحب نے اس نقطہ نظر پر تنقید کی ہے۔ اگر کہیں انکی تفسیر میں کوئی سائنسی حوالہ آیا وہ صرف سائنسدانوں اور علم سائنس کی قدرت الٰہی اور علم الٰہی کے سامنے بے بس ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

۸۔ اہم مصادر و مراجع:

تفسیر ضیاء القرآن کے اسلوب کو سمجھنے کے لیے اس تفسیر کے بنیادی ماخذ بھی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ پیر صاحب نے اپنی لکھتے وقت اگرچہ متقدمین و متاخرین اور ہم عصر علماء کی تفاسیر کے علاوہ کتب آحادیث تحقیقی رسائل میں شائع ہونے والے مضامین، کتب تصوف اور انسائیکلوپیڈیا کو خصوصی طور پر مد نظر رکھا۔ لیکن سب سے زیادہ حوالہ جات علامہ آلوسی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر روح المعانی، قاضی ثناء اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر مظہری اور امام قرطبی رحمتہ اللہ علیہ کی الجامع الاحکام القرآن کے ہیں۔ تفسیری رجحانات کے حوالہ سے جامعیت کا عنصر لیے ہوئے ہے اور اپنی بعض انفرادی خصوصیات کی بناء پر معروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر ضیاء القرآن سابقہ مفسرین کے اقوال و آراء کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ اس میں جدید و قدیم تمام تفسیری رجحانات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

صاحب ضیاء القرآن نے تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث کے سنہری اصول کے تحت جابجا قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے ضیاء القرآن کو زینت بخشی ہے۔ انتہائی تحقیق و تدقیق اور حکمت واحتیاط سے علماء متقدمین اور اخرین کے تفسیری اقوال نقل فرمائے ہیں۔[1]

تفسیر ضیاء القرآن میں آپ کو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ اسلام فرد اور معاشرے کے جملہ روحانی اور تہذیبی مسائل کا سائنسی اور علمی زبان میں متعین کمل اور قابل اطمینان حل پیش کرتا ہے لیکن ایک اہم امتیاز اس مقام پر ذکر کرنا ضروری ہے کہ پیر صاحب نے تہذیبی ، سیاسی، اقتصادی اور روحانی مسائل کا حل سرسید اور ان کے دیگر مقلدین کی طرح معذرت خواہانہ لہجے میں نہیں دیا بلکہ اپنی مجاہدانہ الکار اور اسلاف سے ملنے والے علمی ورثہ کی روشنی کے لیے انتہائی متانت و وقار کا اسلوب اختیار کیا ہے۔

[1] ضیاء القرآن، جلد ا، ص ۱۲

۹ -نوعیت تفسیر:

ہمارے بعض مفسرین نے عموماً کشاف و بیضاوی نے قرآن حکیم کے مقدس جملوں کی تراکیب نحوی لکھی ہے تا کہ قرآن کریم کی فہمی سہولت پیدا ہو سکے۔ اُردو تفاسیر میں تغیر حقانی کی طرح پیر صاحب نے تفسیر کشاف و بیضاوی کو مد نظر رکھتے ہوئے قرآن حکیم کی لطیف عبارات میں تراکیب نحوی لکھی ہے۔ جس سے قاری کو دوران مطالعہ مشکلات سے نجات مل سکتی ہے۔

پیر کرم شاہ صاحب ضیاء القرآن میں اسرائیلی روآیات پر سخت تنقید کی ہے اور انہیں عقلی و نقلی دلائل سے باطل ثابت کیا ہے۔ اسی طرح آپ نے ہر جلد کے آخر میں پہلے تحقیقات لغویہ کے عنوان سے وہ الفاظ لائے ہیں جن کو نہایت عرق ریزی سے تحقیق کے دائرے میں لایا گیا ہے تا کہ یہ بتایا جاسکے کہ مطلوبہ لفظ کی تفسیر تشریح کس سورہ مبارکہ میں کسی مقام پر کی گئی ہے۔ بعض اوقات مصنف بظاہر دو مترادف الفاظ میں فرق بھی واضح کر دیتے ہیں۔[1]

۱۰۔ اردو تفاسیر میں ضیاء القرآن کا مقام و مرتبہ:

پیر کرم شاہ الازہری صاحب کی تفسیر کو اُردو تفاسیر میں چند وجوہ کی بناء پر ایک خاص مقام حاصل ہے:

ا۔ فصاحت و بلاغت:

آپ کی تفسیر کا ہر جملہ فصاحت و بلاغت سے مزین ہے۔ آپ نے اسے ایسے دلنشین انداز میں تحریر فرمایا ہے کہ روح وجود میں آ جاتی ہے۔ یہ طرز بیان استدلال کی نظافتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ زور تحریر تو کئی تفاسیر میں موجود ہے۔ لطافت بھی ہے مگر الفاظ کے اندر جو روح پیر صاحب نے پیدا فرمائی ہے اصناف سخن میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

۲۔ ترجمہ میں کمال:

قرآن کریم کے تراجم کا انداز دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر ترجمہ تحت اللفظ ہو تو مطالب کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے اور ادب بھی نظر انداز ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے مترجمین کے ترجموں کے فقرے لوگوں نے مذاق کے طور پر نقل کر رکھے ہیں اور مختلف محفلوں میں انہیں دہرایا جاتا ہے۔

پیر صاحب نے ترجمے میں ایک کامیابی کی راہ نکالی ہے کہ ترجمہ ادبی حسن بھی لئے ہوئے ہے اور الفاظ کو اس طرح جوڑا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے قلب و ذہن معطر ہو جاتے ہیں۔ یہ ترجمہ کا لفظی پہلو تھا معنوی پہلو یہ ہے کہ ترجمہ اسلام کے مسلمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو اور اس انداز میں بھی نہ ہو کہ آداب بارگاہ خداوندی مجروح ہوں۔[2]

۳۔ ماضی سے رابطہ:

پیر صاحب نے جن تفاسیر سے یا جن کتب لغت و بلاغت سے اقتباسات لئے ہیں۔ یا جن حضرات سے آپ نے دوران تفسیر استفادہ کیا ہے اور دور حاضر کے مختلف مکاتب فکر کے جن علماء کے حوالے لئے ہیں آپ نے ان کے نام ادب اور علمی عظمت کے ساتھ لئے ہیں۔ اُن کے تفاسیری مقام کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔ علامہ بیضاوی، صاحب کشاف، امام جصاص، علام ابن العربی، امام ابن جریر، صاحب تفسیر

---

[1] ضیائے حرم، لاہور، شمارہ اپریل ۲۰۰۲، ص ۶۹

[2] ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، ۱۹۹۹، ص ۱۷۴

مظہری، امام رازی، امام غزالی رحمتہ اللہ علیہم آپ کی تفسیر میں نظر آتے ہیں۔ اور علمی دنیا کے یہ تیر ہائے تاباں اپنی نورانی شعائیں آپ کے دل و دماغ پر بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اختلافی مسائل میں طرز استدلال:

اختلافی مسائل میں پیر صاحب کے طرز استدلال کے متعلق یہ بات خصوصی طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ آپ نے تقریبا ہر اختلافی مسلے پر قلم اٹھایا ہے۔

آپ نے اُن لوگوں پر تنقید کی ہے اور اُن کے موقف سے اختلاف بھی کیا ہے اس اختلافی بحث کے دوران آپ نے ان لوگوں کی نظر پر بھی بھی حیرت اور تاسف کا اظہار تو ضرور کیا ہے لیکن آپ نے اپنی نوک قلم پر کبھی کوئی ایسا لفظ نہیں آنے دیا جس سے کسی کی غیرت نفس مجروح ہو یا کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ آپ جس سے اختلاف کرتے آپ اُسے چیلنج نہیں کرتے بلکہ دعوت فکر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو تفاسیر کو پڑھنے والے نیز تمام مکاتب فکر کے سنجیدہ حلقوں میں آپ کے لئے احترام کے جذبات اب بھی موجود ہیں۔[1]

ہمارے اکثر مفسرین خصوصاً برصغیر کی حد تک آپ نے مسلک کو سامنے رکھتے ہوئے تفسیر فرماتے ہیں اور ان کا یہ حق بھی ہے۔ مگر مسلک کی خدمت کا جذبہ اکثر دلائل سے ہٹ کر دوسرے مسالک کے مسائل کے بیان میں آپ نے قلم کو استعمال کرنا شروع کر دیں تو یہ آپ نے مسائل کو نظر انداز کرنے والی بات ہو گی۔ مگر پیر کرم شاہ صاحب اس میدان میں اپنی تفسیر کے اعتبار سے منفرد نظر آتے ہیں اس لیے کہ آپ نے کوئی دقیق مسئلہ سمجھانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھایا اور نہ ہی راہ اعتدال کو چھوڑا۔ آپ کے اسی منفرد انداز کی وجہ سے تفسیر ضیاء القرآن کا مطالعہ کرنے والا شخص اپنی ذہن سے تفریق اور گروہ بندی کو نکال دیتا ہے۔

تفسیر ضیاءُ القرآن اردو زبان کی اہم اور منفرد تفاسیر میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے مصنف حضرت پیر کرم شاہ الازہریؒ نے قرآنِ کریم کے معانی و مفاہیم کو نہایت مؤثر، جامع اور ادبی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ تفسیر کا طرزِ نگارش ادبی محاسن سے مالا مال ہے اور اس میں سادگی کے ساتھ ساتھ فصاحت و بلاغت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

پروفیسر حافظ احمد بخش فرماتے ہیں کہ اگرچہ اردو ادب میں ابوالکلام آزادؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور شورش کاشمیریؒ جیسے ناموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مگر پیر کرم شاہ الازہریؒ کی تحریروں، خصوصاً * تفسیر ضیاءُ القرآن * کے مطالعے کے بعد یہ کہنا بجا ہے کہ وہ اردو تفاسیر ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے صفِ اول کے ادیبوں میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔

یہ تفسیر اپنی فکری گہرائی، ادبی حسن، اور عصری مسائل پر قرآنی بصیرت کے اظہار کے لحاظ سے اردو تفاسیر میں نمایاں مقام رکھتی ہے۔[2]

تبیان القرآن کا تعارف

اردو زبان میں لکھی گئی اور جدید تفاسیر میں تفسیر تبیان القرآن نہایت جامع اور کامل تفسیر ہے۔ یہ بہت عام فہم اور آسان الفاظ میں تحریر کی گئی ہے۔ تفسیر تبیان القرآن کا تعلق تفسیر بالماثور سے ہے جس میں ہر آیت کی تفسیر سے متعلق جتنی آیات اور احادیث ممکن ہو سکیں، نقل کی گئی ہیں۔ یہ تفسیر 12 جلدوں میں فرید بک سٹال، اردو بازار لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے۔

---

[1] ایضاً، ماہنامہ ضیائے حرم ص ۶۹

[2] ایضاً ص ۱۷۴

علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ نے 10 رمضان المبارک 1414ھ بمطابق 21 فروری 1994ء کو تفسیر تبیان القرآن لکھنے کی ابتداء کی، اور 12 ذوالحج 1426ھ بمطابق 13 جنوری 2006 کو اس تفسیر کی تکمیل ہوئی۔ یعنی تقریب بارہ سال کے عرصہ میں بارہ جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر مکمل ہوگئی۔[1]

وجہ تالیف

علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ نے اس تفسیر کی وجہ تالیف یہ بیان فرمائی ہے کہ ہمارے علماء متقدمین نے تفسیر کے موضوع پر اس قدر زیادہ اور عظیم کام کیا ہوا ہے کہ اس پر کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علماء اسلام کی زیادہ تر کاوشیں عربی زبان میں ہیں جن تک عام اردو دان طبقہ کی رسائی نہیں ہے۔ تو اس بات کی بے شک ضرورت تھی کہ علوم اور معارف کے ان جواہر پاروں کو سہل اور عام فہم انداز میں جدید اسلوب نگارش کے مطابق اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ اسی طرح قرآن مجید کے تراجم کا حال ہے۔ ہمارے بزرگ علماء نے اپنے اپنے زمانہ میں اس دور کی زبان کے مطابق قرآن مجید کے مفاہیم کو اردو زبان میں منتقل کیا اور ان کی یہ مساعی بہت قابل قدر بلکہ لائق رشک ہیں۔ لیکن زبان کا اسلوب اور مزاج وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے میں محسوس کرتا تھا کہ اس دور کے اردو پڑھنے والوں کے مزاج اور ان کے اسلوب کے مطابق قرآن مجید کا ترجمہ کرنا چاہیے تاکہ پڑھنے والوں کے لیے وہ ترجمہ اجنبی اور نامانوس نہ ہو۔[2] چونکہ علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ اس تفسیر کو عوام کے لیے آسان انداز میں تحریر کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اس تفسیر میں آیات کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کیا ہے۔ وہ دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔

"میں نے قرآن مجید کا ترجمہ تحت اللفظ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ایسا ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ سے بالکل الگ اور عربی متن کی رعایت کیے بغیر قرآن مجید کے مفہوم کی ترجمانی کی جائے۔ میں نے اپنے آپ کو قرآن مجید کے الفاظ اور عبارت کا پابند رکھنا ہے لیکن لفظی ترجمہ نہیں کیا۔[3]

علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ کا تفسیری منہج

تفسیر تبیان القرآن میں مؤلف کا انداز یہ ہے کہ وہ جس سورت کی تفسیر شروع کرتے ہیں، پہلے اس سورت کے بارے میں اس کے مکی و مدنی ہونے کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں اور اس کے اہم مضامین کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس سورت کا شان نزول بیان کرتے ہیں، اس سورت کا پچھلی سورت کے ساتھ ربط اور مناسبت بیان کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان سورتوں کے فضائل کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ پھر اس سورت کی کچھ آیات لکھتے ہیں اور اس کا سلیس اردو ترجمہ کرتے ہیں۔ علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ نے ترجمہ میں زیادہ تر علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ کے ترجمہ البیان سے استفادہ کیا ہے۔[4] پھر ان آیات کی تفسیر اور مشکل الفاظ کی وضاحت کرتے ہیں۔ آیات کے کلمات کی موزونیت اور خوبصورتی اور ان کے باہمی ربط و تناسب کو بیان کرتے ہیں۔ آیات کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے وہ کلامی مسائل، عصمت انبیاء، بعث بعد الموت اور توحید و رسالت کا ذکر کرتے ہیں۔ اس تفسیر میں انھوں نے اسلام کے مسلمہ عقائد کو دلائل سے مزین کیا ہے، اور فرق ضالہ اور مختلف فیہ مسائل میں جو رائے ان کو خلاف حق لگی تو اس پر مدلل رد کیا ہے۔ قرآن مجید کی جن آیات میں احکام اور مسائل کا ذکر ہے، وہاں تمام فقہی مذاہب کا دلائل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

---

[1] تبیان القرآن، ج ۱۲ ص ۱۰۵۵

[2] تبیان القرآن، ج ۱ ص ۳۷

[3] ایضا، ج ۱ ص ۳۷

[4] ایضا، ج ۱، ص ۳۹

علامہ سعیدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں منہج سلف کی اتباع کرتے ہوئے تفسیر بالماثور کا اہتمام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے سے پہلے مفسرین کی آراء کو لیا ہے، لیکن اس میں غلو سے اجتناب کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"ہمارے متقدمین مفسرین نے قرآن کریم کی تفسیر میں جو نکات بیان کیے ہیں، ان میں سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ لیکن جو بہت بعید نکات ہیں، یا دور از کار تاویلات ہیں ان کو ترک کر دیا ہے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں زیادہ سے زیادہ احادیث اور آثار کو پیش کروں۔[1]"

عام طور پر مفسرین صرف حدیث ذکر کر دیتے ہیں، لیکن اس کا حوالہ ذکر نہیں کرتے۔ تفسیری اقوال کے حوالہ جات اور احادیث کی تخریج کے حوالے سے علامہ سعیدی رحمۃ اللہ علیہ کی محنت اور عرق ریزی قابل تعریف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عام طور پر مفسرین صرف حدیث کا ذکر کر دیتے ہیں اس کی تخریج نہیں کرتے۔ میں نے کافی محنت اور جان فشانی کر کے تبیان القرآن میں درج ہر حدیث کی تخریج کی ہے اور اس کا مکمل حوالہ بیان کیا ہے۔ البتہ حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ حافظ الہیثمی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ علم حدیث میں بہت ثقہ ہیں اس لیے ان کی تصانیف میں درج مسلّم ائمہ حدیث کی روایات کو ان حوالوں کے ساتھ ذکر کر دیا ہے اور کہیں کہیں اصل ماخذ کے حوالوں کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔[2]

علامہ سعیدی رحمۃ اللہ علیہ دوسروں کی محنت کو تلبیس کے ذریعے اپنی طرف منسوب نہیں کرتے، بلکہ علمی دیانتداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس محقق کا نام ذکر کرتے ہیں جس کی تحقیق سے استفادہ کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے بعض مصنفین ایسا کرتے ہیں، مثلاً حافظ سیوطی کا ذکر کیے بغیر اس حدیث کو ان حوالوں کے ساتھ ذکر کر دیتے ہیں اور یہ تلبیس کرتے ہیں کہ گویا اس حدیث کو انھوں نے ان دس حدیث کی کتابوں سے خلاق کیا ہے۔ اس طرح علامہ شامی نے اگر کسی مسئلہ کو دس فقہاء کے حوالوں سے ذکر کیا ہے تو وہ علامہ شامی کا ذکر کیے بغیر اس مسئلہ کو ان دس فقہاء کے حوالوں سے ذکر کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے پر یہ تاثر قائم کرتے ہیں کہ گویا انھوں نے اس مسئلہ کو ان دس فقہاء کے حوالوں سے تلاش کیا ہے، میرے نزدیک یہ تکلم میں سخت مذموم ہے۔ اگر حافظ منذری یا حافظ البیشمی یا حافظ سیوطی نے کسی حدیث کو دس ائمہ کے حوالوں سے ذکر کیا ہے تو میں نے اس طرح لکھا ہے کہ حافظ منذری یا حافظ سیوطی نے اس حدیث کو ان دس ائمہ حدیث کے حوالوں سے ذکر کیا ہے اور اس کا مکمل حوالہ دیا ہے اور کسی کی محنت اور جانفشانی کو اپنی طرف منسوب کرنے کی مذموم تلبیس نہیں کی۔ اسی طرح فقہاء کے حوالہ جات کا معاملہ ہے۔[3]

نئے مسائل میں غور و فکر اور اجتہاد کی کافی وسعت اور گنجائش ہے۔ اور ظاہر ہے اس میں علماء کی آراء مختلف ہوتی ہیں۔ اور جو عالم بھی کسی تازہ اور نئے مسئلہ میں غور و فکر سے اجتہاد کرتا ہے وہ پوری دیانتداری اور خدا خوفی سے اس کے حکم کو دلائل شرعیہ سے اخذ کرتا ہے۔ اگر کسی عالم کو اس سے اختلاف ہو تو اس کو دلائل کے ساتھ اپنا نظریہ تو بیان کرنا چاہیے، لیکن فریق مخالف پر کیچڑ نہیں اچھالنی چاہیے اور طعن و تشنیع سے کام نہیں لینا چاہیے۔ علامہ سعیدی رحمۃ اللہ علیہ اسی اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے مجتہد فیہ مسائل میں اپنی آراء بیان کرتے ہیں اور اپنی وجہ ترجیح دلائل سے واضح کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ بد قسمتی سے ہمارے ہاں لوگوں کا یہ مزاج نہیں ہے اور لوگوں کا جس شخص سے کسی علمی مسئلہ میں اختلاف ہو، وہ اس کو جاہل، خائن اور اس نوع کے دیگر القابات سے نوازتے ہیں، بلکہ اس کو دین اور ملت سے خارج

---

[1] تبیان القرآن، ج ا ص ۳۹

[2] ایضاً، ج ا ص ۳۷

[3] ایضاً، ج ا ص ۳۸، ۳۷

کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ان تازہ مسائل میں سے بعض مسائل میں ہمارا دوسرے علماء سے اختلاف ہے لیکن ہم نے اپنا موقف دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان علماء کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا، اور ان کے اعزاز، اکرام اور احترام کو پوری طرح قائم رکھنا ہے۔[1]

تفسیری مصادر

علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں زیادہ تر احکام القرآن، الجامع لاحکام القرآن، ابحر المحیط، تفسیر کبیر، الدر المنثور اور روح المعانی سے استفادہ کیا ہے۔ جدید تفاسیر میں سے تفسیر منیر، تفسیر مراغی، فی ظلال القرآن اور تفسیر قاسمی بھی پیش نظر رکھی۔ اس کے علاوہ علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ نے متعدد تفاسیر سے استفادہ کیا جن کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اور ان کے حوالہ جات تبیان القرآن کی ہر جلد میں موجود ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: تنویر المقیاس، تفسیر الحسن البصری، معانی القرآن، تفسیر قتی، جامع البیان، احکام القرآن، تفسیر سمرقندی، التبیان فی تفسیر القرآن، مشکل اعراب القرآن، النکت والعیون، کشاف، المحرر الوجیز، مجمع البیان، زاد المسیر، کشف الاسراء وعدۃ

الابرار، تفسیر القرآن الکریم، الجامع لاحکام القرآن، انوار التنزیل، مدارک التنزیل، لباب التاویل، تفسیر نیشاپوری التفسیر الکبیر، البحر المحیط، تفسیر القرآن، تفسیر الثعالبي، نظم الدر، الدر المنثور، جلالین، منہج الصادقین، تفسیر ابو السعود، التفسیرات الاحمدیہ، روح البیان، الفتوحات الالہیہ، تفسیر صاوی وغیرہ- اسباب نزول کے بیان میں جامع البیان پر زیادہ تر اعتماد کیا ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ، مسند امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ، موطا امام مالک رحمتہ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب الآثار، موطا امام محمد رحمتہ اللہ علیہ، امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی المسند، مصنف عبد الرزاق رحمتہ اللہ علیہ، مصنف ابن ابی شیبہ رحمتہ اللہ علیہ، سنن دارمی رحمتہ اللہ علیہ، مسند بزاز رحمتہ اللہ علیہ، صحیح ابن حبان رحمتہ اللہ علیہ، مستدرک حاکم رحمتہ اللہ علیہ، امام بیہقی رحمتہ اللہ علیہ کی سنن کبری، علامہ زیعی رحمتہ اللہ علیہ کی نصب الرایہ اور امام طحاوی رحمتہ اللہ علیہ کی شرح معانی الآثار سمیت متعدد کتب حدیث سے استفادہ کیا گیا ہے۔ علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تبیان القرآن کی تصنیف کے دوران انھوں نے جن تفاسیر سے استفادہ کیا ہے ان میں سر فہرست امام رازی کی تفسیر کبیر اور علامہ قرطبی کی الجامع لاحکام القرآن ہے۔ اس کے بعد روح المعانی اور روح البیان ہیں۔ اور استدلال میں تایید اور تقویت کے لیے تقریبا تمام دستیاب تفاسیر کے حوالے رہے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کی الدر المنثور سے بھی انھوں نے بہت استفادہ کیا ہے۔ امام ابو منصور ماتریدی رحمتہ اللہ علیہ کی تفسیر تبیان (مؤلف کی تفسیر تبیان القرآن) کی بارہویں جلد (کی تالیف) کے دوران طبع ہو کر آئی، اس سے بھی انھوں نے جس قدر ممکن ہوا، استفادہ کیا۔[2]

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی تفسیر کی تالیف میں مختلف موضوعات پر لکھی گئی متفرق کتب سے استفادہ کیا جن میں درج ذیل کتب شامل ہیں: تورات، انجیل، اعراب القرآن، مشکل اعراب القرآن، معانی القرآن، کشف الاسرار وعدۃ الابرار، الفتوحات الالہیہ، خزائن العرفان، الصحاح، المفردات، تہذیب الاسماء واللغات، تاج العروس، تاریخ الامم والملوک، الاستیعاب الشفاء البدایہ والنہایہ الصواعق المحرقہ، نسیم الریاض مذاہب اربعہ کی کتب فقہ اور اسی طرح مذہب شیعہ کی کتب، قوت القلوب التذکرۃ، قاعدہ جلیلہ، روض الریاحین، مکتوبات امام ربانی اتحاف السادۃ المتقین، الملفوظ، ہدیۃ المہندی، حفظ الایمان وغیرہ

---

[1] تبیان القرآن، ج ا ص ۳۹

[2] ایضا ا ص ۵۶

تفسیر تبیان القرآن کے بارے میں علماء کی آراء

ذیل میں علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ کی اس تفسیر کے بارے میں عصر حاضر کے جید علماء کی آراء اور تبصرے نقل کیے گئے ہیں تا کہ اس تفسیر کا علمی مقام واضح ہو سکے۔

1- مفتی منیب الرحمن مد ظلہ

اردو زبان میں علامہ صاحب کی تفسیر تبیان القرآن سب سے مبسوط، مفصل اور مدلل تفسیر ہے، آج کی تاریخ تک یہ اردو زبان کی واحد تفسیر ہے کہ جس میں تفسیر القرآن بالقرآن اور تفسیر القرآن بالحدیث کو بالترتیب درجہ اولی اور ثانیہ میں رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد آثار صحابہ و تابعین، پھر ائمہ مجتہدین کے اجتہادات و آراء کو ترجیح دی گئی ہے۔ جدید تحقیق، طبی اور سائنسی تحقیقات کے بھی آپ نے دوران تفسیر حوالے دیئے ہیں۔ تمام احادیث اصل مآخذ کے حوالہ جات اور رقم الحدیث کے ساتھ درج ہیں اور یہ سارا کام مؤلف نے اپنی علمی ریاضت اور مشقت سے کیا ہے، انھیں کمپیوٹر تک رسائی نہیں تھی۔ آپ کی تفاسیر اور شروح حدیث میں جابجا ایسی معرکتہ الآراء علمی و تحقیقی ابحاث شامل ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو مستقل رسائل کی صورت میں ایڈٹ کر کے طبع کرایا جا سکتا ہے۔[1]

2۔ شیخ عبد المالک رحمتہ اللہ علیہ

علامہ سعیدی رحمتہ اللہ علیہ کی مایہ ناز تفسیر تبیان القرآن پر جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے عالم دین شیخ عبد المالک صاحب نے جماعت اسلامی کی فکر کے ترجمان ماہوار چھپنے والے رسالے ترجمان القرآن لاہور، بابت ماہ اپریل 1991ء کے شمارے میں ایک نہایت جامع اور دلآویز تبصرہ کیا ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

شیخ الحدیث غلام رسول سعیدی عصر حاضر کے ممتاز مفسر، عظیم القدر محدث اور وسیع النظر فقیہ ہیں۔ متعدد گراں قدر علمی تصانیف ان کی باقیات الصالحات ہیں۔ خصوصا سات جلدوں پر مشتمل صحیح مسلم شریف کی شرح پیش کر کے ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں علمی گہرائی، گیرائی اور استحضار میں خصوصی مقام حاصل ہے۔ مختصر مدت میں ایک مثالی اور جامع علمی کتاب پیش کر دیتے ہیں۔ تفسیر کا مطالعہ کرنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مصنف نے ان خصوصیات اور اصولوں کی پوری طرح پاسداری کی ہے۔ شاید وہ عصر حاضر کے ان چند مفسرین میں شامل ہیں جو ایک مسلک سے وابستہ ہونے کے باوجود مسلکی تعصب کا شکار نہیں ہوئے اور اپنے مسلک میں متعصب ہونے کے باوجود دوسرے مسالک کا بھی کما حقہ احترام کرتے ہیں۔ مصنف کے نقطہ نظر سے بعض جگہ ہمیں اختلاف ہے اور ان سے علمی اختلاف کا حق ہماری طرح ہر صاحب علم کو ہے۔ لیکن مصنف نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے، علمی تحقیق میں جس جرات اور دیانتداری اور اعتدال کا مظاہرہ کیا ہے، اس پر وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں۔[2]

---

[1] کالم زاویہ نظر، مفتی منیب الرحمن، روزنامہ دنیا ۲۰۱۶

[2] مولانا محمد ناصر خان چشتی، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۹ء ص، ۶۵ تا ۷۰

باب دوم
تعلق باللہ اور تعبیر رؤیا منتخب تفاسیر کی روشنی میں

فصل اول: تعلق باللہ اور معاشرتی مسائل

صبر منتخب تفاسیر کی روشنی میں

صبر کا لغوی مفہوم

صبر عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مادہ صبر ہے۔ ص ب ر اس کے حروف اصلی ہیں اور یہ باب ضرب یضرب سے صبر، یصبر، صبرا ہے، جس کے لغوی معنی ہیں:

ا۔ صبر: حبس النفس عن الجزع

یعنی مصیبت کے وقت اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا

۲۔ صبر کا مطلب ہے برداشت کرنا، ضبطِ نفس کرنا، اور بے صبری یا جزع وفزع سے بچنا۔

یعنی آدمی مشکل یا آزمائش کے وقت خاموشی اور اطمینان کے ساتھ انتظار کرے اور بے قراری ظاہر نہ کرے۔

" .صبر علی الأمر" کے معنی ہیں کسی بات کو برداشت کرنا اور اس پر ثابت قدم رہنا۔

" .صبر عن الأمر" کے معنی ہیں کسی چیز سے خود کو روک لینا، جیسے: صبرت نفسي عن كذا یعنی "میں نے اپنے نفس کو اس چیز سے روکے رکھا۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم[1]" میں صبر کا مطلب ہے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکنا جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، یعنی ضبطِ نفس کے ساتھ ثابت قدم رہنا۔

۳۔ صبر کے معنی ہیں اپنے نفس کو قابو میں رکھنا، مصیبت کے وقت ثابت قدمی اور دلیری کا مظاہرہ کرنا۔[2] مصیبت کے وقت شکوہ و شکایت اور جزع فزع سے روکے رہنا۔[3]

صبر کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاح میں صبر کا معنی ہے ارادے کی مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشات کا وہ انضباط جس سے ایک شخص ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلہ میں اپنے قلب وضمیر کے پسند کئے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔[4]

حقیقت میں صبر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے کسی کام کے کرنے یا کسی کام سے رکنے پر نفس کو آمادہ کرتا ہے۔ اس کی یہ تعریف بھی کی جاتی ہے کہ "طلب رضائے الٰہی کے لئے خلاف طبع امور پر نفس کو آمادہ کرنا صبر ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ صبر مصائب کے باوجود حسن ادب کی روش پر قائم رہنے اور شکوہ وشکایت سے زبان کو بچانے کا نام ہے۔ ابو علی الرفاق کہتے ہیں کہ صبر کی حد یہ ہے کہ تقدیر پر

---

[1] الکہف ۱۸:۲۸

[2] اویس، معلوف المنجد، ناشر: نشر پرتو، استشارات پیراستہ، ایران ۱۹۷۴ء

[3] ایضا، علوف المنجد

[4] مودودی، سید ابوالاعلیٰ تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۸۰، ج ا ص ۷۳، ۷۴

اعتراض نہ کرے، شکوہ و شکایت کے جذبات سے پاک ہوں۔ محض مصیبت کا اظہار صبر کے منافی نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں حضرت ایوب علیہ السلام کو "عبد صابر قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے مَسَّنِيَ الضُّرُّ [1] (مجھے بیماری لگ گئی ہے) کہہ کر اپنی تکلیف کا اظہار کیا تھا، مگر چونکہ یہ اظہار اللہ تعالیٰ سے شفا کی طلب کے لئے تھا اور شکوہ و شکایت کے جذبات سے خالی ہو کر تھا اس لئے اسے صبر کے منافی نہیں بتایا گیا۔[2] ایک قول یہ بھی ہے کہ صبر دل کی شجاعت کا نام ہے اور شجاعت تھوڑی دیر کے صبر کا نام ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہش نفس کے مقابلے میں دینی و عقلی تقاضوں کو ترجیح دینا صبر ہے۔ تمام اقوال کا خلاصہ یہی ہے کہ ضبط نفس اور شرعی احکام پر ثابت قدمی اور مصائب کو جھیلنا اور جزع و فزع کی نفسیات سے دور رہنا صبر ہے۔[3]

صبر کے مختلف معانی

صبر ایک اہم اسلامی تصور، ایک خاص ذہنی و روحانی رویہ ہے جو کردار میں وقار، توازن اور استقامت پیدا کرتا ہے۔ یورپ کی کسی زبان میں اس کا مفہوم کسی ایک جامع لفظ میں ادا کرنا مشکل ہے۔[4]

لفظ صبر کے مفہوم کی وسعت تو بے پایاں ہے مگر اہل علم نے اس کو چار اہم معنوں میں بیان کیا ہے:

۱۔ خالق کائنات کی بندگی پر جم جانا۔ ۲۔ صبر عزم و قوت کی بنیاد ہے۔

۳۔ راضی برضاء ربنا۔ ۴۔ اللہ کی راہ میں سب کچھ سہہ جانا۔

صبر کی کیفیتیں اور اقسام

۱۔ صبر کی کیفیتیں

صبر کے درج بالا مفاہیم پر غور کریں تو صبر کی کیفیت اپنی حیثیت و حالت کے اعتبار سے اس طرح بھی بیان کی جاسکتی ہے:

۱۔ ایک صبر وہ ہے جو نفس کو اطاعت و عبادت کی استقامت و پابندی کی محنت و مشقت برداشت کرنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا دہ صبر ہے جو گناہوں سے اجتناب کرنے کی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے۔

۳۔ تیسرا صبر وہ ہے جو دنیا کی زائد از ضرورت چیزوں سے قطع تعلق کر لینے کی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے۔

۴۔ چوتھا صبر وہ ہے جو کسی دینی و دنیاوی آفت و مصیبت اور سختی و پریشانی کو برداشت کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔

اب جو شخص صبر کی ان چار صورتوں کو اختیار کرلے وہ اطاعت و عبادت کی راہ پر سکون و استقامت کے ساتھ گامزن رہے گا، گناہوں سے محفوظ و مامون رہے گا، دنیا کی آفات و بلیات سے سلامتی اور آخرت کے عذاب سے نجات پائے گا، علاوہ ازیں بہت اجر و ثواب سے نوازا جائے گا۔[5]

۲۔ صبر کی اقسام

صبر کے متعلق جو کچھ قرآن اور حدیث میں آیا ہے اس کا اعادہ جزوی طور پر متصوفانہ اخلاقی ادب میں ہوا ہے، لیکن تصوف میں اس لفظ نے در حقیقت ایک بہت ہی بلند قسم کی فنی اصطلاح کی صورت اختیار کر لی ہے کیونکہ اخلاقی نظام فکر میں صبر ایک بنیادی فضیلت ہے۔

---

[1] الانبیاء ۲۱:۸۳

[2] ندوی، محمد اسجد قاسمی، صبر حقیقت اور اہمیت، ماہنامہ زندگی نو، دعوت نگر نئی دہلی، شمارہ جنوری ۲۰۰۴، ص ۱۳، ۱۴

[3] ایضاً، ص ۱۳، ۱۴

[4] اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳، مطبع اول، ج ۱۲، ص ۲۷

[5] محمد قطب الدین خان دہلوی، مظاہر حق (جدید)، شرح مشکوۃ المصابیح، دار الاشاعت کراچی ۱۹۹۴ء، ج ۴، ص ۷۹۴

اہل علم صبر کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں:

ا۔ جسمانی صبر

اس سے مراد جسمانی صعوبتوں کو برداشت کرنا ہے، خواہ وہ فعلی ہوں جیسے مشکل کاموں کا سرانجام دینا، یا انفعالی ہوں مثلاً مختلف مصائب و آلام کو برداشت کرنا وغیرہ اور صبر کی یہ قسم قابل ستائش بھی ہے۔[1]

ب۔ روحانی صبر

اس سے مراد ہے کہ فطری اور جبلتی دوائی کے خلاف لذات نفسانی کو ترک کر دینا اور زہد کو اختیار کرنا ہے۔[2] مثلاً کم سے کم کھانا، کم سے کم سونا اور زینت والی چیزوں کا ترک کر دینا۔

فخر الدین الرازی سورۃ آل عمران کی آخری آیت یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا ورابطوا[3] کی تفسیر کرتے ہوئے صبر کو چار اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

ا) دو صبر جس کا تعلق عقائد توحید مثلاً عدل، نبوت، آخرت اور اس طرح کے دوسرے مسائل میں غور فکر کرنے اور ان پر دلیل لانے اور مخالفوں کے شبہات کے جواب تلاش کرنے سے ہے اس کام کے لئے جس محنت کی ضروت اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے وہ صبر ہے۔

ب) صبر ہی وہ قوت برداشت ہے جو کسی شخص کو واجبات یعنی ان اعمال کی ادائیگی پر آمادہ کرتی ہے جس کا وہ شرعاً مکلف ہو یا جن کے کرنے کی شرع فرمائش کرے۔

ج) منہیات یعنی وہ اعمال جن کے کرنے سے شریعت نے روکا ہے ان سے احتراز کرنے میں ثابت قدمی کا اظہار بھی صبر کی قسم ہے۔

د) شدائد و آفات دنیا کو برداشت کرنا تو صبر کی ایک معروف قسم ہے۔[4]

صبر کی اہمیت

صبر کے وسیع مفاہیم اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بندہ مومن کی زندگی میں صفت صبر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اس کی زندگی کا مقصد اللہ سبحانہ وتعالی کی رضا کا حصول ہے۔ دنیا ایک امتحان گاہ ہے اور صبر ہی وہ طاقت ہے جو آخرت کی کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس دنیا کا کوئی کام بھی صبر کے بغیر درست نہیں ہوتا۔ اسی طرح کسی گناہ سے توبہ بھی صبر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ درج ذیل عنوانات سے صبر کی اہمیت کی مزید وضاحت ہوتی ہے:

ا) صبر کی بدولت انسان اشرف المخلوقات ہے

۲) اللہ تعالی کی نشانیوں کو صبر سے ہی پہچانا جاتا ہے

۳) تبلیغ دین میں صبر کی اہمیت

۴) اللہ سبحانہ وتعالی کی شان صبر

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۲ ص ۵۱

[2] ایضا، ج ۱۲ ص ۵۱

[3] ال عمران ۳:۲۰۰

[4] الرازی فخر الدین محمد بن عمر، تفسیر الفخر الرازی، الجزا التاسع، دار الفکر س ن، ص ۱۶۰

۵) بدلہ لینے کی اجازت کے باوجود صبر کرنا ہی افضل ہے

۶) صبر اختیار کرنا بہر حال ہمت کے کاموں میں سے ہے

۷) صبر کی اخلاقی اہمیت

۸) صبر کے ذریعے ہی حسن خلق کو اپنایا جاتا ہے

صبر کا شرعی حکم

امام ابن القیم کے بقول صبر بہ اجماع امت واجب ہے اور اس کی تین وجوہ ہیں۔

۱) قرآن میں آپ کو اور اہل ایمان کو بیسیوں مقامات پر صبر کا حکم دیا گیا ہے، جس سے وجوب مستفاد ہوتا ہے۔

۲) قرآن میں متعدد مقامات پر صبر کی مخالفت سے سختی سے روکا گیا ہے۔[1] اور اہل ایمان سے فرمایا گیا:

فَلَاتُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ[2] تو تم ان (کافروں) کے مقابلے میں پیٹھ مت پھیرو۔

اس لئے کہ پیٹھ پھیر کر بھاگنا بے صبری کا مظاہرہ ہے۔ دشمن سے مقابلہ خواہ جنگ کی صورت میں ہو یا علمی اقتصادی میدان میں بندہ مومن ہر جگہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے اس کی نظر دنیا کے وقتی فائدوں کی بجائے آخرت پر رہتی ہے وہ یقین رکھتا ہے کہ فتح یا شکست دونوں میں سے جو بھی حاصل ہو بہر حال وہ اجر سے محروم نہ رہے گا۔ اس کے بر خلاف بے صبری کا مظاہرہ اُس کے اس ایمان کے منافی عمل ہو گا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَاتُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ[3] اپنے اعمال اکارت مت کرو۔

اس لئے کہ اعمال برباد کرنا خلاف صبر ہے۔ صبر نیک عمل کرنے کے لیے ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کی حفاظت کرنے کے لیے بہت اہم ہے۔ تھرولی کی وجہ سے اپنی نیکی کا اظہار کرتے رہنا یا احسان جتاتے رہنے سے اجر کی بجائے انسان موجب عذاب قرار پاتا ہے لہذا صبر کی راہ ہی اختیار کرنی چاہیے۔

وَلَاتَهِنُوا وَلَاتَحْزَنُوا[4] دل شکستہ نہ ہوا اور غم نہ کرو

اس لئے کہ دل شکستگی اور مایوی بے صبری اور صبر کے خلاف امور میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کامل رکھنے والوں کے لیے ہمت چھوڑ بیٹھنا ممکن نہیں۔ انہیں اگر ایک جگہ تنگی یا مایوسی کا سامنا ہو تو وہ دوسری جگہ اللہ کی وسعتوں کو تلاش کر لیتے ہیں پھر جو راہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے کھول دے وہ اسے اللہ تعالی کی رضا سمجھ کر خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالی فرماتے ہیں:

وَلَاتَسْتَعْجِل لَّهُمْ[5] ان (دشمنوں) کے حق میں جلد بازی نہ کیجئے۔

معاملہ خواہ دوست کا ہو یا دشمن کا جلد بازی ان امور میں سے ہے جو حوصلے اور صبر کے خلاف ہے۔ دین اسلام بندہ مومن سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہر ایک سے اچھی امید رکھے آخرت کی لازوالی زندگی اور جنت میں ملنے والے بے پایاں اجر کا یقین ہو، دشمن کی طرف سے اسے خواہ کیسی ہی اذیت پہنچے وہ اس کی ہدایت کے لیے ہی کوشش کرتا رہے اور بد دعا کرنے اور بدلہ لینے سے حتی الامکان گریز کرے۔

---

[1] ندوی، محمد اسجد قاسمی، صبر حقیقت اور اہمیت، ماہنامہ زندگی نو، ص ۳۷

[2] الانفال ۸:۱۵

[3] محمد ۴۷:۳۳

[4] ال عمران ۳:۱۳۹

[5] الاحقاف ۴۶:۳۵

بے صبری سے ممانعت کی یہ آیات صبر کے وجوب کی دلیل ہیں۔

۳) دنیا کی کامیابیاں بھی اس کے حصہ میں آتی ہے جو حوصلہ اور صبر سے پانے کا انتظار کر سکتا ہے اور اس کے لیے کوشش اور استقامت کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح آخرت کے بہترین انجام کار کے لیے سعی و کوشش کرنے والے کو خواہ دنیا میں کچھ نہ ملے وہ صبر کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول میں لگا رہتا ہے۔[1]

صبر سے متعلق آیات کا منتخب تفاسیر کی روشنی میں جائزہ

تفسیر معارف القرآن

آیت نمبر 1: وَ جَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ-قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا-فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ-وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ [2]

ترجمہ: اور لائے اس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ بولا یہ ہر گز نہیں بلکہ بنا دی ہے تم کو تمہارے جیو نے ایک بات اب صبر ہی بہتر ہے اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو۔

خلاصہ تفسیر: جب یعقوب علیہ السلام کے پاس آنے لگے تھے تو یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون بھی لگا لائے تھے کہ کسی جانور کا خون ان کی قمیص پر ڈال کر اپنی قول کی سند کے لیے پیش کیا یعقوب علیہ السلام نے دیکھا تو کرتا کہیں سے پھٹا نہیں تھا۔ جیسا کہ طبری نے ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ یوسف کو بھیڑیا نے ہر گز نہیں کھایا بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے سو میں صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہو گا صبر جمیل کی یہ تفسیر کہ اس کے ساتھ کوئی حرف شکایت نہ ہو طبری نے مرفوع حدیث بیان کی ہے اور جو بات تم بتاتے ہو اور میں اللہ ہی مدد کرے کہ اس وقت مجھے ان پر صبر آجائے اور آئندہ تمارا جھوٹ کھل جائے بہر حال حضرت یعقوب صبر کر کے بیٹھ رہے۔[3]

مفتی شفیع صاحب نے اس آیت کریمہ کی تشریح میں دین کے دو اصول ذکر فرمائے:

دین کا اصول اول صبر: مفتی صاحب نے اس آیات کریمہ میں صبر کے مختلف اقسام بیان فرمائے جن میں اول: صبر جمیل کے متعلق ذکر کیا ہے، دوم: یہ کہ ہر کام میں اللہ تعالی سے مدد مانگنی چاہیے، سوم: آیت سے مستنبط دو مسئلے ذکر کیے ہیں، چہارم: پیراہن یوسف کے متعلق کچھ عجائبات ذکر کیے ہیں: تفصیل یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسف کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تا کہ والد کو بھیڑیے کے کھانے کا یقین دلائیں مگر اللہ نے ان کا جھوٹ ظاہر کرنے کے لیے ان کو اس سے غافل کر دیا کہ کرتے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو پھاڑ بھی دیتے جس سے بھیڑیا کا کھانا ثابت ہوتا انہوں نے صحیح سالم کرتے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکے میں ڈالنا چاہا یعقوب علیہ السلام نے کرتے کو صحیح سالم دیکھ کر فرمایا میرے بیٹو یہ بھیڑیا کیسے حکیم اور عقلمند تھا کہ یوسف کو اسی طرح کھایا کہ کرتا کہیں سے نہیں پھٹا اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام پر ان کی جعل سازی کا راز فاش ہو گیا اور فرمایا:

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا-فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ-وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ

یعنی یوسف کو بھیڑیا نے نہیں کھایا بلکہ تمہارے ہی نفوس نے ایک بات بنائی اب میرے لیے بہتر یہی ہے کہ صبر کروں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس پر اللہ سے مدد مانگو۔

---

[1] ندوی، محمد اسجد قاسمی، صبر حقیقت اور اہمیت، ماہنامہ زندگی نو، ص ۳۷

[2] یوسف ۱۲:۱۸

[3] محمد شفیع، معارف القرآن، ج ۵، ص ۲۷۔۲۸

مفتی صاحب نے اس آیت کے ذیل میں چند فقہی مسائل بھی ذکر کئے ہیں جو درجہ ذیل ہیں:

مسئلہ نمبر 1: یعقوب علیہ السلام نے کرتے کو صحیح سالم ہونے سے برادران یوسف کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو فریقین کے دعوے اور دلائل کے ساتھ حالات اور قرائن پر بھی نظر کرنا چاہیے۔

قمیض کے متعلق عجائبات ماوردی نے فرمایا کہ:" پیراہن یوسف بھی عجائب روزگار میں سے ہے "تین عظیم الشان وقائع اسی پیراہن یعنی کرتے سے وابستہ ہیں:

پہلا۔ واقعہ خون آلود کر کے والد کو دھوکہ دینے اور کرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے۔

دوسرا۔ واقعہ زلیخا کا ذکر اس میں بھی یوسف کا کرتا ہی شہادت میں پیش ہوا۔

تیسرا۔ واقعہ یعقوب کی بینائی واپس آنے کا اس میں بھی ان کا کرتا ہی اعجاز کا مظہر ثابت ہوا۔

مسئلہ نمبر 2: بعض علماء نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام نے جو بات اپنے صاحبزادوں سے اس وقت کہی تھی کہ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا یعنی تمہارے نفوس نے ایک بات بنائی ہے یہی بات اس وقت بھی کہی جب مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین ایک چوری کے الزام میں پکڑے گئے اور ان کے بھائیوں نے یعقوب علیہ السلام کو اس کی خبر کی تو فرمایا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں اپنی رائے سے کہیں تھی ان میں سے پہلی بات صحیح نکلی اور دوسری صحیح نہیں تھی کیونکہ اس میں بھائیوں کا قصور نہ تھا اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی غلطی پیغمبروں سے بھی ابتداء ہو سکتی ہے اگرچہ بعد میں ان کو بوحی الٰہی غلطی پر قائم رہنے نہیں دیا جاتا نیز قرطبی میں ہے کہ اس سے ثابت ہوا کہ رائے کی غلطی بڑے بڑوں سے ہو سکتی ہے اس لیے ہر صاحب رائے کو چاہیے کہ اپنی رائے کو متہم سمجھے اس پر ایسا جمود نہ کرے کہ دوسروں کی بات سننے ماننے کو تیار نہ ہو۔[1]

آیت نمبر 2: قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ عَسَى ٱللَّهُ أَن يَأْتِيَنِى بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُۥ هُوَ ٱلْعَلِيمُ ٱلْحَكِيمُ[2]

ترجمہ: بولا کوئی نہیں بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات اب صرف صبر ہی بہتر ہے شاید اللہ لے آئے میرے پاس ان سب کو وہی ہے خبر دار حکمت والا۔

خلاصہ تفسیر: یعقوب علیہ السلام کے معاملے میں ان سب سے غیر مطمئن ہو چکے تھے تو سابق پر قیاس کر کے فرمانے لگے کہ بنیامین چوری میں ماخوذ نہیں ہوا بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے سو خیر مثل سابق صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہو گا مجھ کو اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو یعنی یوسف علیہ السلام اور بنیامین اور جو بڑا بھائی اب مصر میں رہ گیا ہے ان تینوں کو مجھ تک پہنچا دے گا کیونکہ وہ حقیقت حال سے خوب واقف ہے اس لیے اس کو سب کی خبر ہے کہ کہاں کہاں اور کس کس حال میں ہیں اور وہ بڑی حکمت والا ہے جب ملانا چاہے گا تو ہزاروں اسباب و تدابیر درست کر دے گا۔[3]

علامہ قرطبی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مجتہد جو بات اپنے اجتہاد سے کہتا ہے اس میں غلطی بھی ہو سکتی ہے یہاں تک کہ پیغمبر بھی جو بات اپنے اجتہاد سے کہتا ہے ابتدائی غلطی ہو جانا ممکن ہے جیسے اس معاملے میں پیش ایا کہ بیٹوں کے سچ کو جھوٹ قرار دیا مگر انبیاء کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو منجانب اللہ غلطی پر متنبہ کر کے اس سے ہٹا دیا جاتا ہے اور انجام کار وہ حق کو پا لیتے ہیں یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ

---

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۲۷۔۲۸

[2] یوسف ۱۲:۸۳

[3] معارف القرآن، ج۵، ص۱۲۶۔۱۲۸

حضرت یعقوب علیہ السلام کے ذہن میں بات بنانے سے مراد وہ بات بنانا ہو جو مصر میں بنائی گئی کہ ایک خاص غرض کے ماتحت جعلی چوری دکھلا کر بنیامین کو گرفتار کیا گیا جس کا انجام آئندہ بہترین صورت میں کھل جانے والا تھا اس آیات کے اگلے جملے سے اس طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے جس میں فرمایا عَسَى ٱللَّهُ أَن يَأْتِيَنِى بِهِمْ جَمِيعًا یعنی قریب ہے کہ اللہ تعالی ان سب کو مجھ سے ملا دے گا۔[1]

خلاصہ: یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مرتبہ جو صاحبزادوں کی بات کو تسلیم نہیں کیا اس کا حاصل یہ تھا کہ در حقیقت نہ کوئی چوری ہوئی ہے اور نہ بنیامین گرفتار ہوئے ہیں بات کچھ اور ہے یہ اپنی جگہ صحیح تھا مگر صاحبزادوں سے اپنی دانست کے مطابق جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہ تھا۔

آیت نمبر 3: قَالُوٓا۟ أَءِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ قَالَ أَنَا۠ يُوسُفُ وَهَٰذَآ أَخِى قَدْ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْنَآ إِنَّهُۥ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ [2]

ترجمہ: بولے کیا سچ تو ہی ہے یوسف کہا میں یوسف ہوں اور یہ ہے میرا بھائی اللہ نے احسان کیا ہم پر البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ ضائع نہیں کرتا حق نیکی والوں کا۔

مفتی شفیع صاحب نے اس آیت کے مطابق جو اہم بات ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ صبر و تقوی ہر مصیبت کا علاج ہے اور پھر اس کے ذیل میں کچھ احکام ذکر کیے ہیں وہ یہ ہے کہ تقوی یعنی گناہوں سے بچنا اور تکلیف پر صبر و ثابت قدم رہنا یہ دو صفتیں ایسی ہیں جو انسان کو ہر بلا و مصیبت سے نکال دیتی ہے قرآن کریم نے بہت سے مواقع میں انہی دو صفتوں پر انسان کی فلاح و کامیابی کا مدار رکھا ہے یعنی اگر تم نے صبر و تقوی اختیار کر لیا تو دشمنوں کی مخالفانہ تدبیریں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ مفتی صاحب نے مزید یہ لکھا ہے کہ بظاہر یہاں یہ دعوی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے متقی اور صابر ہونے کا دعوی کر رہا ہے کہ ہمارے صبر و تقوی کی وجہ سے ہمیں مشکلات سے نجات اور درجات عالیہ نصیب ہوئے مگر کسی کو خود اپنے تقوی کا دعوی کرنا بنص قرآن ممنوع ہے فَلَا تُزَكُّوٓا۟ أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ ٱتَّقَىٰ[3] یعنی اپنی پاکی نہ بتلاؤ اللہ ہی زیادہ جانتا ہے کہ کون متقی ہے مگر یہاں در حقیقت دعوی نہیں بلکہ تحدیث بالنعمت اور اللہ تعالی کی احسانات کا ذکر ہے کہ اس نے اول ہم کو صبر اور تقوی کی توفیق عطا فرمائی پھر اس کے ذریعے تمام نعمتیں عطا فرمائی۔[4]

تفسیر ضیاء القرآن

قولہ تعالی: وَ جَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِہٖ بِدَمٍ كَذِبٍ-قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا-فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ-وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔

قرآن کریمہ کے سورہ یوسفؑ میں جو صبر کے متعلق آیات ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک صبر یعقوب علیہ السلام کا بیٹے کے بارے میں اور دوسرا صبر یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کے متعلق یعنی انکی تکالیف پہنچانے پر اور باقی آزمائشوں پر جیسے واقعہ زوجہ عزیز مصر (زلیخا) کے متعلق۔

اس آیت میں حضرت یعقوب کے صبر کے متعلق بیان ہے۔ اسکی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ جب یوسفؑ نے وہ خواب دیکھا اور والد صاحب نے انکو اسکے متعلق تعبیر بھی بتایا جس میں یوسفؑ کے اعلی مقام و مرتبہ کی طرف اشارہ تھا۔ تو انہوں نے یوسفؑ کو منع فرمایا

---

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۱۲۶۔۱۲۸

[2] یوسف ۱۲:۹۰

[3] النجم ۵۳:۳۲

[4] معارف القرآن، ج۵، ص۱۳۸۔۱۳۹

بتانے سے، اس لئے کہ وہ ان کے خلاف کوئی تدبیر یا مکر و فریب نہ کریں۔ آخر کار انھوں نے حضرت یوسفؑ کے بارے میں حیلے شروع کر دئے ان میں سے ایک یہ تھا کے والد صاحب کو اس پر راضی کیا کہ اس کو ہمارے ساتھ کل کھیل کود کے لئے جانے دے والد صاحب نے سمجھایا کہ نہیں۔ آخر کار لے کر گئے اور گہرے کنویں میں پھینک کر اسکی قمیض کو خون آلودہ کر کے اپنے والد کے پاس لے کر آ گئے اور کہا کہ ہم سب کھیل کود میں لگے ہوئے تھے اور ایک بھیڑیا آکر یوسف کو کھا گئے اگر آپ کو یقین نہیں تو یہ اسکا قمیض ہے۔ یہ دیکھو۔ یعقوبؑ نے کہا کہ یہ کام آپ لوگوں نے اپنی طرف سے بنایا ہے اور میرا کام ہے صبر جمیل اور اللہ سے مدد مانگنا، جو تم بیان کرتے ہو[1]۔

سولت کا معنی - ہے۔ مزین اور آراستہ کرنا سولت ای زینت۔

التسویل تزیین النفس لماتحرص علیه وتصویر القبیح بصوره الحسن[2]

ترجمہ: نفس کا کسی ناپسندیدہ یا بُرے کام کو اچھا بنا کر پیش کرنا۔

فصبر جمیل یعقوب علیہ السلام نے کہا میں تو اس جانکاہ حادثے پر صبر جمیل کروں گا صبر جمیل اس صبر کو کہتے ہیں جہاں نہ شکوہ و شکایت ہو اور نہ جزع و فزع کا گزر ہو، **والصبر الجمیل :هو الذی لا جزع فیه ولا شکوه**[3]۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی جلالت شان اور مقام نبوی کو یہی لائق تھا کہ وہ دامن صبر کو مضبوطی سے تھام لیں اور کسی ایسی حرکت کا ارتکاب نہ کریں جو عام لوگوں سے ایسے موقع پر سرزد ہوتی ہے اس لیے انہوں نے کہا فصبر جمیل یہاں پر پیر کرم شاہ صاحب نے تورات کا حوالہ دے کر اس کا برعکس لکھا ہے یعنی جو تورات میں ہے وہ اس کے خلاف ہے لیکن یہ کوئی بعید بات نہیں اس لیے کہ وہ اصل تورات تو ہے نہیں تحریف شدہ ہے تو اس کا اعتبار نہیں۔

نوٹ: یہاں پر ایک اہم بات تفسیر میں ذکر کی ہے سوال اور جواب کی صورت میں وہ سوال یہ ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کے غلط بیانی کا یقین ہو گیا تو وہ یوسف علیہ السلام کی جستجو میں کیوں نہ نکلے؟ اور اس کے فراق میں کیوں اتنی تکلیفیں برداشت کی؟ امام فخر الدین الرازی نے لکھا ہے اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس امر کا تو اتنا یقین تھا کہ یوسف علیہ السلام تو زندہ ہیں لیکن اس کے باوجود اب خاموش ہو کر بیٹھے رہنے کی دو وجہ ہو سکتی ہے پہلی وجہ کہ اللہ تعالی نے تلاش کرنے سے منع فرما دیا ہو تا کہ ان کا صبر و استقامت کا اچھی طرح امتحان ہو جائے اور دوسری وجہ یہ اس لیے کہ آپ کو یقین تھا کہ اللہ تعالی خود یوسف علیہ السلام کی حفاظت کرے گا یہ تفسیر کبیر کے حوالے سے ذکر کیا **وایضا لعله علیه السلام علم ان الله تعالی یصون یوسف عن البلاء والمحنه وان امره سیعظم بالاخرة ثم لم یر دهتک استار سرائر اولاده ۔۔۔فلما وقع یعقوب السلام في هذه البلیة رای ان الاصوب الصبر والسکوت والتفویض الامر الی الله تعالی بالکلیة (الکبیر)**۔

اس آیت کریمہ میں جس صبر کا ذکر ہے وہ یعقوب علیہ السلام کا بنیامین کے بارے میں ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب دوبارہ حضرت یوسف کے بھائیوں نے غلہ لینے کے لیے آئے اور ساتھ میں بنیامین بھی آئے تو سب بھائی کھانے کے لیے دو دو بیٹھ گئے لیکن بنیامین اکیلا رہ گیا تو یوسف علیہ السلام نے اس کو اپنے پاس الگ کر کے بتایا کہ میں آپ کا بھائی یوسف ہوں غم نہ کرو، جب ان کو غلہ وغیرہ دینے لگوں تو یوسف علیہ السلام نے کہا میں آپکو اپنے پاس رہنے کے لیے یہ حیلہ بنایا ہے کہ آپ کے سامان میں خاص قسم کا برتن

---

[1] تفسیر ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۴۱۶

[2] ایضا، ص ۴۱۶

[3] القرطبی، ابو عبد اللہؒ، محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الأنصاری الخزرجی شمس الدین (المتوفی: 671): الجامع لأحکام القرآن التشہیر بتفسیر القرطبی، ج ۹، ص ۱۹۷

رکھوادیا تو جب قافلہ جانے لگا تو قافلے کے پیچھے سے آواز آئی کہ روکو ہم نے بادشاہ کا پیالہ گم کر دیا یعنی وہ نہیں مل رہا تم میں سے کسی نے لے لیا ہے۔ آخر کار قافلہ رکا تلاشی لی وہ پیالہ بنیامین کے سامان سے نکلا یوسف کے بھائیوں نے کہا ہمارے والد صاحب کمزور ہیں کسی اور کو رکھ لو اسے چھوڑ دو بادشاہ نے کہا آپ کے ہاں چور کی کیا سزا ہے بھائیوں نے کہا کہ اس کو اس کی چوری کے بدلے میں قید کر دیا جاتا ہے تو عزیز مصر نے کہا یہ قید ہو گا مختصر یہ کہ بنیامین کو اپنے پاس رکھ کر بھائی چلے گئے جب بھائیوں نے یہ واقعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنایا تو اس کا غم اور دکھ اور بڑھ گیا بھائیوں نے کہا ہم سچ کہہ رہے ہیں اس نے چوری کی اور اس کی سزا میں قید ہو گیا والد صاحب نے کہا کہ تمہارے نفوس نے آراستہ کر دی ہے تم کو یہ بات اور کہا میرا کام ہے صبر کرنا اور قریب ہے کہ اللہ تعالی لے کر آئیں گے سب کو میرے پاس بے شک وہ جانتا ہے اور حکیم ہے یہاں پر ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام کو علم نہ تھا یوسفؑ کا لیکن اب اس دفعہ سے تو پتہ چلتا ہے کہ جب ان کے بھائی چلے گئے اور ان کو اس بنیامین کی وجہ سے کتنی رنج و غم حزن وغیرہ ملا اور یوسف تو مصر کے حکمران بھی تھے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے والد صاحب کی طرف کسی آدمی کو کیوں نہیں بھیجا بلانے کے لیے؟ یہ ایک اہم سوال ہے اس کا جواب قاضی ثنا اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے دیا ہے **فان قيل قال البغوي كيف استجاز يوسف ان يعمل مثل هذا ابابيه ولم يخبره بمكانه وخبس اخاه مع علمه بشرة وجدا به ففيه معنا العقوق وقد بيت الرحم وقله الشفق قلنا اكثر الناس فيه واستحي انه عمل ذلک بامر الله تعالى۔**

اگر کہا جائے کہ امام بغوی نے فرمایا: "یوسف علیہ السلام نے یہ کام (یعنی اپنے بھائی بنیامین کو روک لینا) اپنے والد (یعقوب علیہ السلام) سے چھپا کے کیسے رکھا؟ انہیں اپنے مقام کی خبر کیوں نہ دی؟ اور اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے والد اس کی جدائی سے سخت غمگین ہوں گے؟

کیا اس میں والد کے ساتھ کچھ نافرمانی یا رحم کے رشتے کو کاٹنے جیسی بات نہیں؟"

تو ہم کہتے ہیں:

" اس بارے میں لوگوں نے مختلف رائے دی ہے، مگر بہتر اور زیادہ درست بات یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا، اس لیے ان کے عمل میں کوئی نافرمانی یا قصور نہیں۔"

مفسر امام بغوی نے یہ سوال اٹھایا کہ یوسف علیہ السلام جیسا نبی اپنے والد سے چھپ کر ایسا کام کیسے کر سکتے ہیں جو بظاہر انہیں اذیت میں مبتلا کرے۔

اس سوال کا مقصد نبی کے کردار پر غور کرنا ہے، نہ کہ اعتراض کرنا۔

بظاہر یہ عمل "عقوق" (والدین سے نافرمانی) یا "قطعِ رحمی" (رشتہ توڑنا) کے زمرے میں آ سکتا ہے، کیونکہ یوسف علیہ السلام نے اپنے والد کو اطلاع دیے بغیر اپنے بھائی کو روک لیا، جس سے یعقوب علیہ السلام کو مزید غم ہوا۔

تفسیر مظہری اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

یہ سب اللہ کے حکم سے ہوا؛ یوسف علیہ السلام نے خود سے نہیں بلکہ وحی کی ہدایت پر عمل کیا۔ لہٰذا ان کا یہ عمل حکمتِ الٰہی کا حصہ تھا، نہ کہ نافرمانی۔ یہ واقعہ نبی کی ذاتی تدبیر نہیں بلکہ الٰہی منصوبے کا حصہ تھا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے ایک سبق ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے ذریعے صبر، تدبیر، اور وعدۂ الٰہی کی تکمیل کا مظاہرہ فرمایا۔

یہ آیت یا تفسیر نبیوں کے افعال کے بارے میں اصول سکھاتی ہے کہ ان کے ہر عمل میں نیت، وحی، اور حکمت شامل ہوتی ہے، چاہے وہ بظاہر عام انسان کو عجیب کیوں نہ لگے۔

تفسیر تبیان القرآن

صبر جمیل کی تعریف

صبر سے مراد ہے نفس کو ضبط میں رکھنا، مصیبت یا آزمائش میں بے صبری اور شکایت سے بچنا، اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا۔[1] "إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ"[2]۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" إِنَّمَا الصَّبْرُ عِندَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى"[3]۔ حقیقی صبر وہ ہے جو مصیبت کے پہلے لمحے میں کیا جائے۔

صبر جمیل کی تعریف کے متعلق علماء کے اقوال:

امام محمد بن محمد غزالی متوفی 606 لکھتے ہیں اللہ تعالی سے شکوہ اور شکایت کرنا حرام ہے اور جب آدمی اپنے مرض یا مصیبت کا کسی کے سامنے اظہار کرتا ہے[4] اور وہ اس مرض اور مصیبت کو ناپسند کرتا ہے اور اس سے ناراض ہوتا ہے تو یہ اللہ کے فعل کی شکایت ہے اس لیے یہ حرام ہے اگر انسان وہ مرض اور مصیبت کو ناپسند نہیں کرتا ایسے درد کا اظہار کر رہا ہے تو یہ حرام نہیں لیکن خلاف اولی ہے اور بہتر یہ ہے کہ وہ مصیبت اور مرض وغیرہ کا اظہار بالکل نہ کرے کیونکہ اس سے شکایت کا وہم پیدا ہوتا ہے بعض علماء نے کہا ہے جس نے اپنی مصیبت کا اظہار کیا اس نے صبر نہیں کیا اور صبر جمیل کا معنی یہ ہے کہ اس میں شکایت نہ ہو۔[5] نیز تقوی کے بارے میں امام غزالی لکھتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت سلیمان سے کہا مومن کی تقوی پر تین چیزوں سے استدلال کیا جاتا ہے اس کو جو نعمت نہیں ملی اس کے حصول کا اللہ پر بھروسہ رکھے اور جو نعمت مل گئی ہو اس پر اللہ سے راضی رہے اور جو نعمت اس سے جاتی رہی ہو اس پر اچھی طرح صبر کرے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے تعظیم اور اس کی معرفت کی نشانی یہ ہے کہ تم اپنی تکلیف کی شکایت نہ کرو اور اپنی مصیبت کا ذکر نہ کرو۔[6]

صبر جمیل کے اجر سے متعلق احادیث

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے صبر جمیل کے اجر کے متعلق چند احادیث ذکر کی ہے مختلف کتب کے حوالے سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تبارک وتعالی فرماتا ہے جب میں اپنے مومن بندہ کو کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ اپنے عبادت کرنے والا والوں میں سے میری شکایت نہ کریں تو میں اس کو قید سے آزاد کر دیتا ہوں اور اس کا گوشت پہلے گوشت سے بہتر بتا دیتا ہوں اور اس کا خون پہلے خون سے بہتر بنا دیتا ہوں اور از سر نوع اس کے عمل شروع کر دیتا ہوں۔[7]

---

[1] الغزالی، امام ابو حامد۔ احیاء علوم الدین، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۹،، ج، ۴ ص ۶۲

[2] البقرہ:۱۵۳

[3] صحیح البخاري، کتاب الجنائز، حدیث:۱۳۰۲

[4] تبیان القرآن، ج ۵، ص ۷۴۸

[5] احیا العلوم علوم الدین متبوع دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۹ ص ۲۵۵

[6] احیاء العلوم الدین تبع بیروت ۱۴۱۹ جلد ۴ ص ۶۲

[7] سنن کبری جلد ۳، ص ۴۷۵

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ اجر والا وہ گھونٹ ہے کہ بندہ اللہ کی رضا کے لئے غصہ کو ضبط کر کے صبر کا گھونٹ بھر لے۔[1]

حضرت یعقوب علیہ السلام کے ہائے افسوس کہنے کی توجیہ کا ذکر

یہاں پر ایک سوال علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے ذکر کیا ہے دراصل یہ عنوان اس کا جواب ہے اور اس کے مختلف جوابات حدیث کی روشنی میں ذکر کیے ہیں وہ سوال یہ ہے کہ اگر کہا جائے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا یا اسفی ہائے میرا افسوس یوسف کی جدائی پر کہ صبر جمیل کی تعریف تو یہ ہے کہ اس میں جزا قضا نہ ہو، اس میں تو ہے کہ اس کا کیا مطلب یا توجیہ ہے تو یہ اس سوال کا جواب ہے کہ انہوں نے اللہ تعالی کی شکایت نہیں کی بلکہ اللہ تعالی کی طرف شکایت کی ہے صبر جمیل کی منافی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کی شکایت کرتے بلکہ انہوں نے خود یہ کہا کہ میں اپنی پریشانی اور غم کی شکایت صرف اللہ ہی سے کرتا ہوں۔

صبر جمیل کے حصول کے اسباب

امام رازی فرماتے ہیں کہ صبر جمیل کی دو قسمیں ہیں: کبھی صبر جمیل ہوتا ہے اور کبھی غیر جمیل ہوتا ہے صبر جمیل کا ذکر وہ ہے جس میں بندہ کو یہ علم ہو کہ اس مصیبت کو لانے والی ذات اللہ تعالی ہے۔ اور جب مصیبت پر صبر اللہ تعالی کی تقدیر اور اس کی قضا پر راضی رہنے کی وجہ سے نہ ہو بلکہ کسی اور غرض کی وجہ سے ہو تو پھر یہ صبر جمیل نہیں ہو گا، علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے پھر اس کے بعد ایک ضابطہ ذکر کیا ہے وہ یہ کہ انسان کے تمام افعال اقوال اور اعتقادات اگر اللہ تعالی کی رضا کی طلب کے لیے ہوں تو وہ اچھے اور نیک ہیں ورنہ نہیں اسی وجہ سے حدیث میں ہے حضرت واثلہ بن اسقعؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھے ایک کام کے متعلق فتوی دیجیے آپ کے بعد میں اور کسی سے سوال نہیں کروں گا آپ نے فرمایا: **استفتِ قلبک وإن أفتاک المفتون**[2] اپنے دل سے فتویٰ لو، اگرچہ مفتیان تمہیں فتویٰ دیتے رہیں۔

صبر جمیل کے اقسام

جس طرح مصائب اور شدائد پر صبر کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی مصیبت کو مخلوق میں سے کسی سے شکایت نہ کرے اسی طرح غیظ و غضب اور انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود صبر کرنا اور اپنی دشمن اور مجرم سے بالکل تعرض نہ کرنا اور اس کو معاف کر دینا یہ بھی صبر جمیل ہے جیسے حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے انتقام لینے پر قادر ہونے کے باوجود ان کو معاف کر دیا اسی طرح اپنی شہوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی قدرت کے باوجود خوف خدا سے شہوت کی تقاضوں کو ترک کر دینا بھی صبر جمیل ہے اور اس میدان کے امام بھی سیدنا یوسف ہیں۔[3]

غیر اختیاری صبر کے بنسبت اختیاری صبر کی فضیلت

یہ عنوان تبیان القرآن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق بیان کرنے کے بعد ذکر کیا ہے پہلے حسد کی تعریف حسد مذموم اور نہ کرنے کی فضیلت وغیرہ ذکر کی ہے اور اس کے بعد عنوان ذکر کی ہے کہ غیر اختیاری صبر کی بنسبت اختیاری صبر کی فضیلت کیا ہے یعنی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ رنگ و ایمان کی نعمت حاصل ہو چکی ہے اور ان کو وہ نعمت حاصل نہیں ہوتی تو انہوں نے یہ چاہا کہ تم سے وہ نعمت

---

[1] سنن ابن ماجہ، ح ۴۱۸۹

[2] کنز الاعمال رقم الحدیث ۲۹۳۳۹

[3] تبیان القرآن، ج ۵، ص ۴۸۷

زائل ہو جائے خواہ ان کو ایمان کی وہ نعمت حاصل نہ ہو بلکہ وہ اس نعمت کو حاصل کرنا بھی نہیں چاہتے تھے وہ صرف چاہتے تھے کہ تم سے وہ نعمت زائل ہو جائے اور اسے حسد کی وجہ سے لبید بن اعصم یہودی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کے حسد کی وجہ سے اپنے بھائیوں کے مظالم کا شکار ہوئے ان پر جو مصائب آئے شروع سے آخر تک جو تفسیر میں مذکور ہے وہ غیر اختیاری تھے اور قید اور مصیبت یہ آپ کی اختیار کردہ تھی یہ صبر آپ کا اختیاری صبر تھا اور یہی صبر تقوی کو متصف تھا اور بھائیوں کے مظالم پر جو صبر تھا وہ غیر اختیاری تھا اور دوسرا صبر اُفضل تھا اسی لئے اللہ تعالی نے فرمایا إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ۔[1]

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر سے بہت عظیم ہے اس عنوان کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر اور حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر کے متعلق ذکر کیا ہے آخر میں یہ ثابت کیا ہے کہ جتنی تکالیف انبیاء سابقین کو پہنچائی گئی فرداً فرداً ہو تو ہر نبی کی تکالیف کا مجموعہ سے زیادہ تھی لہذا آپ کا اختیاری صبر تمام رسولوں اور نبیوں کے اختیاری صبر سے زیادہ ہے۔

حقیقت صبر کا بیان

حقیقت صبر شرعی معنی صبر کے یہ ہیں کہ نفس کو گریہ وزاری سے اور زبان کو شکایت سے اور اعضاء کو گھبراہٹ سے روک لیا جائے صبر کے اقسام صبر کے تین اقسام ہیں نمبر ایک **صبر عن المعصیہ، صبر علی الطاعہ، صبر عن المصیبہ**

تفصیل ان تینوں کا کچھ اس طرح ہے نمبر ایک معصیت سے رکنے والا صبر اس کے دو سبب ہیں خوف عذاب اور شرم الٰہی نمبر دو طاعت پر قائم رکھنے والا صبر اس کے تین اجزاء ہیں نگہداشت کہو محافظ دوام اور رعایت اخلاص مصیبت کے برداشت کرنے والے صبر اس کی بھی تین بڑی بڑی صورتیں ہیں نمبر ایک گزشتہ نعمتوں کی قدر و قیمت کو موجودہ بلا سے مقابلہ کر کے بلا کو خفیف سمجھا سمجھنا نمبر دو امید رحمت کو قوی بنا کر سختی بلا کو کم کر دینا نمبر تین احسن جزا کے تصور سے مسرور ہو کر دل پر علم بلا کو غالب نہ ہونے دینا آیت زیر تفسیر میں یعقوب علیہ السلام کا صبر صبر بد بلا مصیبت تھا اس لیے وہ ان پر سے انوار ہر سے انواع مذکور سے مکمل تر تھا۔

دین کا اصول دوم استعانت باللہ کا بیان

اصول اول: **فصبر جمیل واللہ المستعان** اس آیت میں اللہ تعالی نے دو چیزیں بیان کی ہیں ایک صبر اور دوسرا استعانت باللہ دین کی ضروری اصول ذکر کی ہے اول صبر جمیل دوم میں استعانت باللہ یہ دو امور کے متعلق ذیل میں کچھ تفصیل سے تحریر کیا جاتا ہے کیونکہ قرآن حکیم کا اسلوب یہی ہے کہ قصہ کے پیرائے میں رہ بڑے بڑے اصول دینے کی تعلیم دیتا ہے اور ہر واقعہ بڑے بڑے انسانی کے ساتھ عرفان اور عرفان ربانی کے بیان کو شامل کر دیتا ہے اس طرح کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم اہستہ دل میں اثر کرتی جاتی ہے اور ذہن نشین ہو جاتی ہے صبر کا بیان قرآن مجید میں تقریبا ۹۰ مقامات پر ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ صبر کرنا باجماع امت سب پر واجب ہے انہی کا قول ہے کہ نصف ایمان صبر ہے اور نصف ایمان شکر ہے صبر کی 16 قسمیں قرآن مجید میں مذکور ہے قرآن مجید کا بیان صبر کے متعلق 16 انواع پر ہے نمبر ایک صبر کرنے کا حکم دیا نمبر دو بے صبری سے منع فرمایا نمبر تین صابرین کی تعریف فرمائی الصابرین والصالقین نمبر چار صابرین کے ساتھ اپنی محبت کا وجوب بتلایا لہبرین نمبر پانچ صابرین کو معیت الہیہ حاصل ہوتی ہے نمبر چھ صبر افضل ہے نمبر سات صابرین کے لیے بہترین جزا ہے نمبر اٹھ صابرین کے لیے بے حساب اجر ہے نمبر نو اللہ تعالی کی طرف سے بشارت کا ذکر ہے نمبر 10 اہل صبر کی نصرت کی ضمانت بلا ممبر 11 اہل صبر کا نام اہل عظیمت رکھا ہے اعمال صالحہ کی جزا اہل صبر ہی کو ملے گی ثواب اللہ نمبر 13 آیات الٰہی سے استفادہ اور عبرت اہل صبر ہی نمبر 14 فرمایا مطلوب محبوب تک رسائی اور دوسرے ربوں سے نجات مرحوم مرحوب سے نجات اور جنت الماوا کا داخلہ صبر ہی کی وجہ سے

[1] تبیان القرآن، ج۵، ص۶۸۶

نمبر 15 صبر ہی کے ذریعے سے درجہ امانت پر فائز ہونا نمبر 16 دیگر آیات قرانیہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کو اسلام اور ایمان اور یقین واحسان کے ساتھ بیان کیا گیا اور یہ ایسے فضائل ہیں جن سے صبر کی فضیلت بخوبی اشکارہ ہو جاتی ہے۔

اصول دوم:- جس کی تعلیم یعقوب علیہ السلام کے جوابوں میں ہے وہ استعانت باللہ یعنی اللہ تعالی سے مدد مانگنا اکثر لوگ اس اصول دین کے نہ سمجھنے سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس فقرہ میں بت پرستو اور خارج از اسلام گروہوں کا ذکر نہیں بلکہ مسلمانوں کا ذکر ہے الوہیت وربوبیت الہ پر اقرار کرنے والوں کا ذکر ہے کہ وہ بھی شرک میں اس وجہ سے پس جاتے ہیں کہ انہوں نے استعانت باللہ کی تعلیم کو بھی سمجھا ہی نہیں سورہ فاتحہ میں ہم بار بار پڑھتے ہیں کہ نماز کے دوران ایاک نعبد وایاک نستعین اے اللہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں دوسری کی عبادت نہیں کرتے صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں کسی دوسرے کی مدد نہیں مانگتے خدا کے سامنے جانا ایک تو یہ کہنا اور نماز سے فارغ ہونا تو کسی اوروں سے مدد کا طالب ہونا یہ کیسے انصاف ہے غور کریں غیر اللہ سے مدد لینا یا تو منفعت حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے یا دفع ضرر کے لیے پھر دو صورتیں جب کوئی شخص غیر اللہ سے مدد کا خواہاں ہو تو استعانت باللہ سے ضرور ہو گیا۔

مومن کے صبر کے متعلق حدیث صحیح

عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ: إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ[1]

یعنی مومن کا کام یہی ہے اس پر ہر طرح بھلائی ملتی ہے اور یہ بات صرف مومن ہی کو حاصل ہے کہ وہ خوشی پر شکر کرتا ہے اور یہ اسی لیے بلا ہے کہ وہ نقصان اور ضرر پر صبر کرتا ہے۔

خلاصہ کلام

قرآن کریم کی تعلیمات میں صبر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں صبر کے متعدد پہلو نمایاں ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعات میں صبر کا تصور نہایت دلنشین انداز میں بیان ہوا ہے۔ مفسرین نے ان آیات کی روشنی میں صبر کی حقیقت، اس کی اقسام اور اس کے دینی اصولوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ معارف القرآن، ضیاء القرآن اور تبیان القرآن کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ صبر صرف مصائب پر برداشت کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا روحانی رویہ ہے جو بندے کو اللہ کی رضا پر راضی اور اس کے فیصلے پر مطمئن کرتا ہے۔

معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے صبر جمیل کی تفسیر کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ صبر جمیل وہ صبر ہے جس میں شکوہ شکایت شامل نہ ہو۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے جھوٹے دعوے پر یہی صبر اختیار کیا۔ اس سے یہ اصول مستنبط ہوا کہ مؤمن کو ہر حال میں اللہ سے مدد مانگنی چاہیے اور صبر کے ساتھ ساتھ توکل علی اللہ اختیار کرنا چاہیے۔ مزید یہ کہ یعقوب علیہ السلام نے قرائن وشواہد سے بیٹوں کے جھوٹ کا پردہ فاش کیا، اس سے فقہی اصول یہ اخذ کیا گیا کہ قاضی کو صرف دعووں پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ حالات و قرائن کو بھی دیکھنا چاہیے۔ یوسف علیہ السلام کے کرتا کے عجائبات اور ان سے وابستہ تین بڑے واقعات (خون آلود کرتا، زلیخا کا مقدمہ اور بینائی کی بحالی) بھی صبر اور اللہ کی حکمت کے جلوے ہیں۔ اس تفسیر میں صبر کو دین کے بنیادی اصول اور انسان کی عملی زندگی کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے۔

تفسیر ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ رحمہ اللہ نے صبر جمیل کی وضاحت کرتے ہوئے یہ نکتہ بیان کیا کہ یہ ایسا صبر ہے جس میں جزع و فزع اور زبان سے شکوہ کا اظہار نہ ہو۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے تورات کے برعکس قرآن کی حقیقت

[1] صحیح مسلم، ح ۷۵۰۰

کو نمایاں کیا کہ انبیاء کرام کے صبر کا معیار عام انسانوں سے کہیں بلند ہے۔ مزید یہ کہ امام رازی کی تفسیر کے حوالے سے یہ وضاحت کی گئی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی جستجو کیوں نہ کی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یا تو اللہ نے انہیں تلاش سے منع فرما دیا تھا تا کہ ان کا امتحان لیا جا سکے، یا پھر انہیں یقین تھا کہ اللہ خود یوسف کی حفاظت کرے گا۔ اسی طرح بنیامین کے واقعے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حکمت عملی کو بھی اللہ کے حکم پر مبنی قرار دیا گیا۔ یوں اس تفسیر میں صبر کو نہ صرف ایک انفرادی رویہ بلکہ ایک اجتماعی اور حکیمانہ فیصلہ بھی قرار دیا گیا ہے۔

تبیان القرآن میں غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ نے صبر جمیل کی مزید تفصیل بیان کی ہے۔ انہوں نے امام غزالی کے حوالے سے لکھا کہ صبر جمیل کا اصل مفہوم یہ ہے کہ انسان مصیبت پر اللہ کی شکایت نہ کرے بلکہ اللہ ہی سے رجوع کرے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا "یا اسفی" کہنا دراصل اللہ کی بارگاہ میں شکایت تھی نہ کہ اس کے خلاف۔ اسی تفسیر میں صبر کی اقسام (مصیبت پر صبر، معصیت سے بچنے کا صبر اور طاعت پر صبر) کو بیان کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ صبر جمیل کا اعلیٰ درجہ وہ ہے جو اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ مزید یہ کہ صبر کے اجر پر احادیث بھی ذکر کی گئیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے افضل وہ گھونٹ ہے جو بندہ صبر کے طور پر برداشت کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ استعانت باللہ کو صبر کے ساتھ جوڑ کر یہ اصول بیان کیا گیا کہ مسلمان کو ہر حال میں اللہ ہی سے مدد مانگنی چاہیے، غیر اللہ سے استعانت ایمان کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

ان تینوں تفاسیر کے مطالعے سے ایک متفقہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ صبر محض ایک اخلاقی صفت نہیں بلکہ دین کا بنیادی اصول ہے۔ صبر کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا اور صبر جمیل کی وہی تعریف درست ہے جس میں شکوہ، بے صبری اور ناشکری شامل نہ ہو۔ صبر کے ساتھ تقویٰ کو لازم قرار دیا گیا ہے، اور قرآن نے ان دونوں صفات کو کامیابی کی کنجی بتایا ہے۔ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کی زندگیوں سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ صبر و تقویٰ ہی انسان کو مشکلات سے نجات اور بلند مراتب عطا کرتے ہیں۔

علم منتخب تفاسیر کی روشنی میں

علم دین کے فضائل

اس بارے میں بہت ساری احادیث ہیں لیکن جو تفسیر میں مذکور ہے چند ان میں سے مندرجہ ذیل ہیں:

بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں اور بے شک انبیاء دینار اور درہم کے وارث نہیں بناتے وہ صرف علم کے وارث بناتے ہیں سو جس شخص نے علم کو حاصل کیا اس نے بہت بڑے حصے کو حاصل کیا۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فقيهٌ واحدٌ أشدُّ علَى الشَّيطانِ مِن ألفِ عابدٍ ایک فقیہ شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔[2]

علم دین کی وجہ سے روز قیامت علماء کی مغفرت

علماء دین کی وجہ سے اللہ تعالی انسان کو دنیا میں مصیبتوں اور آفات سے بچاتا ہے جیسا کہ اس سورت یوسف میں بادشاہ نے خواب دیکھا اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خواب کی تعبیر بتادی وہ تعبیر کتنی کامیاب تھی ایک انسان نہیں بلکہ ملکوں کے لیے خوشحالی کا سبب بنا تو روز قیامت کے مسائل سے نجات کا ذریعہ کیوں نہیں ہوگا حدیث حضرت ثعلبہ بن الحکم رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ عزوجل جب بندوپر اپنا فضل کرنے کے لیے اپنی کرسی پر بیٹھا ہوگا تو وہ علماء سے فرمائے گا میں نے اپنا علم اور اپنا حکم نظام قانون تم کو صرف اس لیے عطا کیا کہ تمہاری مغفرت کرنا چاہتا تھا اور میں بے نیاز ہوں اس حدیث کی راویوں کی توثیق کی گئی ہے مجموعہ الزوائد صفحہ 26 جلد 10 تاہم اس حدیث کا ایک راوی متہم ہے اور البانی نے اس حدیث کا ذکر السلسلة الصحیحہ میں ہے رقم 867 خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے لیکن فضائل میں ضعیف کا اعتبار کیا جاتا ہے اس حدیث کے شواہد بھی ہیں۔

علم کے متعلق فضیلت اور اہمیت

قرآن میں بہت سی آیات میں علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہے

وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا۔ طه۔ يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ۔ سورہ المجادلہ۔ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ سورہ الفاطر۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ الزمر

پہلی آیت کا ترجمہ تشریح اللہ تعالی کا ارشاد گرامی ہے آپ دعا کیجئے اے رب میرے لیے علم کو بڑھادے

[1] سنن ابو داؤد، ح ۳۶۴۱

[2] امام ترمذی، سنن ترمذی، صفت القیامہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ، ح ۲۶۸۱

تشریح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ جب اس آیت کو پڑھتے تو یہ دعا کرتے اللّٰھُمَّ زِدْنِي عِلْمًا إیماناً ویقیناً اے اللہ میرے علم میں اور ایمان میں اور میرے یقین میں زیادتی فرما اس حدیث میں علم کی ترقی کی دعا کرنے کو کہا گیا کیونکہ اس کے بغیر تو انسانیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور اسی سے آدمی اپنے حقیقی مالک کو پہچانتا ہے۔

دوسری آیت کا ترجمہ اللہ تعالی تم میں ایمان والوں کو اور ان لوگوں کو جن کو علم عطا ہو درجات بلند کرے گا۔

تشریح اس آیت میں اہل علم سے مراد علماء با عمل ہے یعنی اللہ با عمل اہل علم کو وہ درجات عنایت کرے گا جو بے عمل لوگوں کو عنایت نہیں فرمائے، کیونکہ ایک طرف تو عالم کو اس کے اجر کا ثواب ملتا ہے تو دوسری طرف جن کو اس نے نیک بات بتائی اور انہوں نے اس پر عمل کیا تو اس کا ثواب بھی اس عالم کو ملتا ہے حضرت حسن رضی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا لوگو اس آیت کو سمجھو یہ تم کو علم کی رغبت دے رہی ہے اللہ تعالی فرمارہا ہے کہ مومن عالم ناواقف سے بہت درجے اونچا ہے کیونکہ علم ہی تمام عبادات کی بنیاد ہے اس لیے قرآن میں بار بار اس کی طرف توجہ دلائی گئی۔

عالم اور متعلم کی فضیلت

ان کی فضیلت بہت سی روایت میں ذکر کی گئی ہے مثلا ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنی شخص پر۔ علم کی فضیلت میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ علم کا ایک باب جیسے آدمی اپنی اصلاح اور اپنے نفس کی اصلاح کے خیال سے سیکھے تو یہ ایک سال کی عبادت سے افضل ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علم کا ایک باب سیکھنا اور اس پر عمل کرنا دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے اس حدیث بالا کو محدثین نے جوامع الکلم میں شمار فرمایا مرقات شرح مشکوۃ۔

علم سے متعلق آیات کا منتخب تفاسیر کی روشنی میں جائزہ

معارف القران

قولہ تعالی: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا- وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ۔ [1]

ترجمہ: اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اس کو حکم اور علم اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو۔

خلاصہ تفسیر: اور جب وہ اپنی جوانی یعنی سن بلوغت یا کمال شباب کو پہنچے ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا مراد اس سے علوم نبوت کا عطا کرنا ہے اور کنویں میں ڈالنے کے وقت جو ان کی طرف وحی بھیجنے کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ وحی نبوت نہیں تھی بلکہ ایسی وحی تھی جیسے حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام کی والدہ کو وحی بھیجی گئی تھی اور ہم نیک لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں جو قصہ یوسف پر تہمت لگانے کا اگے بیان

[1] یوسف ۱۲:۲۲

ہو گا اس سے پہلے ان جملوں میں بتلا دیا گیا ہے کہ وہ سراسر تہمت اور جھوٹ ہو گا کیونکہ جس کو اللہ کی طرف سے علم و حکمت عطا ہوا اس سے ایسے کام صادر ہو ہی نہیں سکتے۔

آیت مذکورہ میں مفتی صاحب نے قوت اور جوانی کے متعلق ذکر کیا کہ یہ قوت اور جوانی کس عمر میں حاصل ہوئی اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں حضرت ابن عباسؓ مجاہد قتادہ نے فرمایا کہ 33 سال عمر تھی ضحاک نے 20 سال اور حسن بصری نے 40 سال بتلائی ہے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حکمت اور علم عطا کرنے سے مراد اس جگہ عطا نبوت ہے اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یوسف علیہ السلام کو نبوت مصر پہنچنے کے بھی کافی عرصہ بعد ملی اور کنویں کی گہرائی میں جو وحی ان کو بھیجی گئی وہ وحی نبوت نہ تھی بلکہ لغوی وحی تھی جو غیر انبیاء کو بھی بھیجی جا سکتی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم علیہ السلام کے بارے میں وارد ہوا ہے **وکذالک نجزی المحسنین** اور ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو مطلب یہ ہے کہ ہلاکت سے نجات دلا کر حکومت و عزت تک پہنچانا یوسف علیہ السلام کی نیک چلنی خدا ترسی اور اعمال صالح کا نتیجہ تھا یہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں جو بھی ایسے عمل کرے گا ہمارے انعامات اسی طرح پائے گا۔[1]

قولہ تعالیٰ: ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ- وَ مَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْکُرُوْنَ۔[2]

ترجمہ: یہ خبریں ہیں عیب کی ہم بھیجے ہیں تیرے پاس اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب وہ ٹھرانے لگے اپنا کام اور فریب کرنے لگے۔

خلاصہ تفسیر: یہ قصہ جو اوپر بیان کیا گیا اپ کے اعتبار سے غیب کی خبروں میں سے ہے کیونکہ اپ کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اس کے جاننے کا نہیں تھا صرف ہم ہی وحی کے ذریعے سے اپ کو یہ قصہ بتلاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اپ ان برادران یوسف کے پاس اس وقت موجود نہ تھے جب انہوں نے اپنا ارادہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا پختہ کر لیا تھا اور وہ اس کے متعلق تدبیریں کر رہے تھے کہ اپ سے یوں کہیں کہ ان کو یوں لے جائے وغیرہ ذالک اس طرح یہ امر یقینی ہے کہ اپ نے کسی سے یہ قصہ سنا سنایا بھی نہیں بس یہ صاف دلیل ہے نبوت کی اور صاحب وحی ہونے کی۔[3]

مفتی شفیع صاحب نے اس آیت کی تفسیر اور تحقیق میں جو لکھا ہے وہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے اس قصے کو پوری تفصیل کے ساتھ صحیح صحیح بیان کر دینا اپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور وحی کی واضح دلیل ہے کیونکہ یہ قصہ اپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہزاروں سال پہلے کا ہے نہ اپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود تھے کہ دیکھ کر فرمایا ہو اور نہ ہی اپ نے کہیں کسی سے تعلیم حاصل کی کہ کتب تاریخ دیکھ کر یا کسی سے سن کر بیان فرما دیا ہو اس لیے بوحی الٰہی ہونے کے اور کوئی راستہ اس علم کا نہیں مزید اس کی تشریح میں لکھا ہے معالم التنزیل کے حوالے سے امام بغوی نے فرمایا کہ یہود اور قریش نے مل کر ازمائش کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر اپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوی نبوت میں سچے ہیں تو یوسف کا واقعہ بتلائیں کہ کیا اور کس طرح ہوا جب اپ نے بوحی الٰہی یہ سب بتلا دیا اور پھر بھی اپنے کفر و انکار پر جمے رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچا اس پر اگلی ایت میں فرمایا گیا کہ اپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے لیے دلائل

---

[1] معارف القرآن ص ۴۵

[2] یوسف ۱۲:۱۰۲

[3] معارف القرآن، ج ۵، ص ۱۵۳

واضح ہونے کے باوجود بہت سے لوگ ایمان لانے والے نہیں اپ صلی اللہ علیہ وسلم کتنی ہی کوشش کرے مطلب یہ ہے کہ اپ کا کام تبلیغ اور اصلاح کی کوشش ہے اس کا کامیاب بنانا نہ اپ کے اختیار میں ہے اور نہ اپ کی ذمہ ہے نہ آپ کو اس کا کوئی رنج ہونا چاہئے۔[1]

مفتی شفیع صاحب نے اس ایت کی تشریح میں دو باتیں ذکر کی ہیں، اخبار غیب اور علم غیب میں فرق ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ -الایة۔

یہ سب کچھ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپؐ کو وحی کے ذریعے بتلاتے ہیں یہی مضمون تقریبا انہی الفاظ کے ساتھ سورہ ال عمران ایت 44 ذٰلِکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِاِلَیْکَ حضرت مریم کے قصے میں ایا ہے اور سورہ ہود کی ایت نمبر 49 میں تلکَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِاِلَیْکَ نوح علیہ السلام کے واقعے سے متعلق آیا ہے۔ ان آیاتوں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حق تعالی اپنے انبیاء علیہم السلام کو بہت سے غیب کی خبروں پر بذریعہ وحی مطلع کر دیتے ہیں خصوصا ہمارے رسول سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غیب کی خبروں کا خاص حصہ عطا فرمایا جو تمام انبیاء سابقین سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو قیامت تک ہونے والے بہت سے واقعات کا تفصیل یا اجمال سے پتہ دیا ہے کتب حدیث میں کتاب الفتن جیسے ترمذی جلد 2 وغیرہ کی تمام حدیثیں اس سے بھری ہوئی ہیں عوام الناس چونکہ علم غیب صرف اسی کو جانتے ہیں کہ کوئی شخص غیب کی خبروں سے کسی طرح واقف ہو جائے اور یہ وصف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود ہے اس لیے خیال کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے مگر قرآن کریم نے صاف لفظوں میں اعلان فرمادیا لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ[2] اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد فرمایا وَ لَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ[3] علم غیب صفت خاصہ ہے اللہ کی اس میں کوئی رسول فرشتہ یا ولی وغیرہ شریک سمجھنا ان کو اللہ کے برابر بنانے کے مترادف اور عیسائیوں کا عمل ہے جو رسول کو خدا کا بیٹا اور خدائی کا شریک قرار دیتے ہیں تو یہ فرق ہے اخبار غیب اور علم غیب میں جو ذکر ہوا۔[4]

تفسیر ضیاالقرآن[5]

قولہ تعالی: وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا- وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ۔

پیر کرم شاہ الازہری صاحب نے اس آیت کی تشریح میں جو ذکر کیا وہ یہ ہے کہ اشدہ کی تفسیر میں عمر کا وہ حصہ جس میں انسان کی جسمانی اور عقلی قوتیں پوری طرح نشو نما پالیتی ہے اس سے اشدہ کہتے ہیں۔

ا۔ حکماء کے نزدیک یہ تیس اور چالیس سال کے درمیان عرصہ کا نام ہے یعنی جب آپ کی فکری صلاحیتں پوری طرح رونما ہو چکیں تو اللہ تعالی نے انہیں اپنے خصوصی نوازشات سے سرفراز فرمایا۔ اور انہیں حکم اور علم عطاء فرمایا۔[6]

---

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۱۵۵

[2] النمل ۲۷:۶۵

[3] الاعراف ۷:۱۸۸

[4] معارف القرآن، ج۵، ص۱۵۸۔۱۵۹

[5] سورہ یوسف آیت نمبر ۲۲

[6] تفسیر ضیاء القرآن ص، ج۲، ص۴۱۹

۲۔ حکم اور علم کے متعلق اور انہیں حکم اور علم عطا فرمایا حکم سے مراد حکمت اور نبوت ہے اور علم سے مراد احکام شرعی کا علم یا خوابوں کی تعبیر کا علم اور عظمت شان کے اظہار کے لیے دونوں کو نکرہ ذکر کیا۔

عَنْ ابْنِ عَبَاسٍ رَضِيَ اللہُ عَنْہُ أَنَ الْحُكْمَ النُّبُوَّةِ وَ الْعِلْمِ الشَّرِيعَةَ وَ تَنْكِيرِ هَا لِلتَّفْخِيمِ [1]

علامہ نظام الدین نشاپوری رحمہ اللہ حکم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ کہ نفس مطمئنہ کو نفس امارہ پر حاکم بنا دیا کیونکہ عالم قدس سے جوہر نفس پر انوار الہیہ اور باقی تجلیات کا فیضان فقط اسی وقت ہوتا ہے۔

فَحِينَئِذٍ تَفِيض الْأَنْوَار الْقُدْسيه وَ الْأَضْوَاء الْإِلَهِيَةِ مِنْ عَالِمِ الْقُدُسْ عَلَى جَوْهَرِ النَفْسِ) تَفْسِير نَشَاْبُورِیَ [2]

محسنین کی تشریح میں لکھتے ہیں ہمارے یہ احسانات صرف حضرت یوسف علیہ السلام تک محدود نہیں بلکہ جو بھی صبر واستقامت عصمت وطہارت اور دیگر خصائل حمیدہ سے اپنے آپ کو متصف کرے گا ہم اسے بھی ان نوازشات سے بہرہ ور فرمائیں گے۔

تفسیر تبیان القرآن

پختگی کے عمر میں اقوال

غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ نے اس آیت کے اندر ان چیزوں کی تحقیق کی ہے **اشدہ** یعنی پختگی کے عمر میں اقوال اور حکم اور علم تفسیر میں اقوال اور محسنین کے تفسیر میں اقوال،[3] سب سے پہلے **اشدہ** میں تفصیل اور اقوال اس سلسلے میں معارف القرآن میں بھی مذکور ہے یہاں پر ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے ایک روایت میں 18 سال بھی مروی ہے امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310 ہجری لکھتے ہیں اشد کا معنی قوت اور شباب کا اپنی انتہا کو پہنچانا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر 18 سال ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر 20 سال یا 33 سال ہو اللہ تعالی کی کتاب میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حدیث میں اس وقت ان کی عمر تعین کی تشریح نہیں ہے اور نہ ہی عمر کی کسی تعین پر اجماع امت ہے اس لیے اس لفظ سے وہی مراد لینا چاہیے جس طرح اللہ عزوجل نے فرمایا ہے یعنی جب وہ اپنی قوت اور شباب کی انتہا کو پہنچ گئے۔[4]

دوسری بات حکم اور علم کی تفسیر میں متعدد اقوال اللہ نے فرمایا ہم نے ان کو حکم اور علم عطا فرمایا مجاہد رحمہ اللہ نے کہا یعنی نبوت سے پہلے عقل اور علم عطا فرمانا۔[5] امام عبد الرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی 597 ہے لکھتے ہیں حکم کی تفسیر میں چار اقوال ہے:

۱۔ مجاہد نے فرمایا حکم سے مراد فقہ اور عقل ہے۔

۲۔ ابن السائب نے کہا حکم سے مراد نبوت ہے۔

---

[1] روح المعانی ۱۱

[2] نظام الدین نشاپوری

[3] تبیان القرآن، ج۵، ص ۲۵۷

[4] جامع البیان، ج ۱۲، ص ۲۳۱ مرتبہ دار الفکر بیروت 1415 ہجری

[5] جامع البیان، ج ۱۲، ص ۲۳۱

۳۔ زجاج نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو حکیم بنا دیا گیا اور زجاج نے کہا ہر عالم حکیم نہیں ہوتا حکیم وہ عالم ہوتا ہے جو اپنے علم کو استعمال کرے اور اس سے جہل کا استعمال کرنا ممتنع ہو۔

۴۔ ثعلبی نے کہا حکم سے مراد ہے صحیح اور درست بات کہنا ارباب لغت نے کہا عرب کے نزدیک حکم وہ قول ہے جس میں جہل اور خطا نہ ہو اور نفس جس چیز کی خواہش کرے اور اس میں ضرر ہو تو وہ اس خواہش کو رد کر دے۔

اسی وجہ سے حاکم کو حاکم کہتے ہیں کیونکہ وہ ظلم اور کج روی سے روکتا ہے اور علم کی تفسیر میں دو اقوال ہیں 1 فقہ 2 خواب کی تعبیر کا علم ۔[1] امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606 لکھتے ہیں حکم اور علم کی تفسیر میں متعدد اقوال ہے حکم اور حکمت کا اصل معنی ہے نفس کو اس کی خواہش سے روکنا اور جو کام انسان کے لیے نقصان دہ ہو اس سے منع کرنا اور حکم سے مراد حکمت عملیہ ہے اور علم سے مراد حکمت نظریہ ہے اور حکمت عملیہ کو حکمت علمیہ پر اس لیے مقدم فرمایا ہے کہ ریاضت کرنے والے پہلے حکمت عملیہ میں مشغول ہوتے ہے پھر اس سے ترقی کر کے حکمت علمیہ تک پہنچتے ہے اور مفکرین پہلے حکمت نظریہ کو حاصل کرتے ہیں اس کے بعد حکمت عملیہ کو حاصل کرتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کا طریقہ پہلا تھا کیونکہ پہلے انہوں نے مصائب اور مشکلات کے اوپر صبر کیا پھر اللہ تعالی نے ان پر مکاشفات کے دروازے کھول دیے اور فرمایا ہم نے ان کو حکم اور علم عطا فرمایا حکمت عملیہ سے مراد ہے نفس کو برائیوں سے بچانا اور نیکیوں سے اراستہ کرنا اور حکمت علمیہ سے مراد ہے نفس الامر اور واقع کے حقائق کا علم اور ادراک نمبر 2 حکم سے مراد ہے نبوت کیونکہ نبی مخلوق پر حاکم ہوتا ہے اور علم سے مراد ہے دین اور شریعت کا علم نمبر 3 حکم سے مراد ہے نفس مطمئنہ کا نفس امارہ پر حاکم ہونا حتی کہ قوت شہوانیہ اور قوت غضبیہ مغلوب اور مقہور ہو جائیں اور عالم قدس سے انوار الہیہ کا جوہر نفس پر فیضان ہو اللہ تعالی نے فرمایا ہم نے ان کو حکم اور علم عطاء فرمایا اس میں یہ اشارہ ہے کہ ان کو قوت عملی اور قوت علمی دونوں کامل ہو چکی تھیں۔[2] علامہ قرطبی نے کہا اگر ان کو بچپن میں نبوت دی گئی تھی تو اس مراد ہے ان کے علم میں زیادتی فرمائی۔[3]

3 محسنین کی تفسیر میں متعدد اقوال

اللہ تعالی نے فرمایا ہم اسی طرح محسنین کو جزا دیتے ہیں امام ابن جوزی نے کہا محسنین کی تفسیر میں تین قول ہیں 1 مصائب اور مشکلات پر صبر کرنے والے 2 ہدایت یافتہ لوگ 3 مومنین۔

امام محمد بن جریر طبری نے کہا اگرچہ اس آیت کا ظاہری معنی یہ ہے کہ ہم ہر محسن کو جزا دیتے ہیں لیکن اس سے مراد سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے کے ساتھ معاملہ کریں گے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو مصائب اور مشکلات میں مبتلا کرنے کے بعد ہم نے ان کو زمین میں اقتدار دیا اور علم عطا فرمایا اسی طرح ہم آپ کو اپنی قوم مشرکین سے نجات عطا فرمائیں گے اور آپ کو زمین پر اقتدار عطا فرمائیں گے اور آپ کے علوم میں اضافہ فرمائیں گے۔[4]

---

[1] زادالمسیر صفحہ ۲۰۱ جلد ۴ مکتب مطبوعہ اسلامی بیروت ۱۴۰۷

[2] تفسیر کبیر صفحہ ۴۳۷ جلد ۶ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵

[3] الجامع لاحکام القرآن جز ۹، ص ۱۴۲

[4] زادالمسیر صفحہ ۲۰۱ جلد ۴

حصول علم دین کا فرض کفایہ ہونا

سورہ توبہ آیت نمبر 122 اس کے آیت کے شان نزول کے متعلق جو دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ عرب کے قبائل میں سے ہر قبیلہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسائل دین اور احکام شرعیہ سیکھتی تھی اور ان کو اپنے پیش امدہ مسائل میں جس شرعی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی آپ سے وہ رہنمائی حاصل کرتی تھی پھر جب وہ قوم اپنے قبیلہ میں واپس جاتی تو وہ ان کو نماز زکوۃ اور اسلام کے دیگر احکام کی تعلیم دیتی اور اسلام کی تبلیغ کرتی اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی اور یہ کہتی کہ جو اسلام لے ایا وہ ہم میں سے ہے حتی کہ ایک شخص اپنے ماں باپ سے جدا ہو جاتا۔[1]

یہ آیات طلب علم کے وجوب میں اصل ہے اور یہ کتاب و سنت کا علم اور اس کی فقہ سمجھ حاصل کرنے کا فرض ہے اور یہ فرض عین نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالی نے تمام مسلمانوں پر یہ واجب نہیں کیا کہ وہ علم دین کے حصول کے لیے سفر کرے بلکہ مسلمانوں کی ایک جماعت پر یہ فرض کیا ہے اس لیے یہ فرض کفایہ ہے طلب علم پر یہ آیات بھی دلالت کرتی ہے۔

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُو۔[2]

اگر تم کو علم نہ ہو تو علم والوں سے پوچھو۔

حصول علم دین کے فرض عین ہونے کا محمل

علم کی دو قسمیں ہیں ایک قسم فرض عین ہے اس کا سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے مثلا نماز ہر شخص پر فرض ہے تو نماز کے احکام اور مسائل کا سیکھنا ہر شخص پر فرض ہے اسی طرح روزہ بھی ہر مسلمان پر فرض ہے تو اس کے مسائل کا علم حاصل کرنا بھی ہر شخص پر فرض ہے ،حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم کا طلب کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور نااہل کو علم سکھانا ایسا ہے جیسے خنزیر و کو جوہر و موتی اور سونے کے ہار ڈال دئے جائیں۔[3]

مذکورہ حدیث فرضیت علم پر لالت کرتی ہے۔[4]

حصول علم دین کے فرض کفایہ ہونے کا محمل

طلب علم کی دوسری قسم فرض کفایہ ہے یعنی تمام احکام شرعیہ اور مسائل دنیا کا ان کے دلائل کے ساتھ علم حاصل کرنا حتی کہ جس کسی عام شخص کو زندگی میں جو عملی یا اعتقادی مسئلہ درپیش ہو تو وہ عالم دین اس مسئلے کا حل پیش کر سکتے ہیں اس میں عبادات معاملات حدود تعزیرات قصاص اور حدیث اور تفسیر کا علم شامل ہے اس علم کا علم کا حال رتبہ اجتہادی پر فائض ہوتا ہے اور اس اجتہاد سے مراد مسائل عصریہ

---

[1] ابن ابی حاتم الرازی، تفسیر ابن ابی حاتم، مکتبۃ نزار مصطفی الباز، مکہ مکرمہ، ۱۹۹۷ج ۶ صفحہ ۱۹۱۱ رقم الحدیث ۱۰۱۲۲

[2] النمل: ۴۳

[3] ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، دارالسلام، ریاض ۱۴۱۷، رقم الحدیث ۱۲۲۴

[4] تبیان القرآن، ج ۵، ص ۲۸۸

میں اجتہاد ہے جیسے وہ اس زمانے ٹیلی فون پر نقاب ویڈیو اور ٹیلی ویژن پر رمضان اور عید اور سیر افطار کا اعلان خاندانی منصوبہ بندی اسقاط حمل اور ایسے دیگر مسائل میں شرعی حکم بیان کرنا۔

اس آیت میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو علم دین کے حصول کے لیے نکلنے کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہی علم مراد ہے اور سب یہ لوگ اس علم کو حاصل کر کے آئیں اور آپ نے علاقے کے لوگوں کو احکام شریعے بتائے تو ان پر ان کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض ہے اور یہی تقلید ہے کہ ہر شخص اتنا وسیع علم حاصل نہیں کر سکتا جو تمام احکام شرعیہ اور امدہ مسائل کے حل کے لیے مشکل ہو اس لیے وہ ان مسائل میں علماء کی طرف رجوع کرے گا اور ان کی تقلید کرے گا۔[1]

خلاصہ بحث

قرآن مجید میں "علم" کو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت اور انبیاء علیہم السلام کی بنیادی خصوصیت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ بالخصوص حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں علم کا کردار نہایت نمایاں ہے۔ جب وہ اپنی جوانی اور پختگی کو پہنچے تو اللہ نے انہیں "حکم" اور "علم" عطا فرمایا۔ اس مقام پر مفسرین نے مختلف زاویوں سے علم کی وضاحت کی ہے اور اس کی حقیقت، اقسام اور اثرات کو بیان کیا ہے۔ معارف القرآن، ضیاء القرآن اور تبیان القرآن میں اس موضوع کی تفصیل ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ علم محض معلومات کا نام نہیں بلکہ حکمت، عمل اور نبوت کی اساس ہے۔

معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے "وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا کہ "علم" سے مراد علومِ نبوت ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو عطا کیے۔ ان کے نزدیک یہ بات بھی اہم ہے کہ کنویں میں ڈالتے وقت جو وحی ہوئی تھی وہ وحیِ نبوت نہیں بلکہ وحی لغوی تھی، جیسا کہ والدہ موسیٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کو ہوئی۔ یہاں علم کو نبوت کے ساتھ خاص کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو کہ اللہ کے مقرب بندوں کو دنیاوی اسباب سے الگ ہو کر غیبی ذرائع سے علم عطا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ یوسف علیہ السلام کا علم ان کی نیک سیرتی اور صبر کا نتیجہ تھا، جو ہر محسن کے لیے اللہ کا عمومی قانون ہے۔

ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ رحمہ اللہ نے "حکم" اور "علم" کو الگ الگ معانی میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک "حکم" سے مراد حکمت اور نبوت ہے جبکہ "علم" سے مراد شریعت کے احکام یا خوابوں کی تعبیر کا علم ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ علم محض ایک نظریاتی وصف نہیں بلکہ عملی رہنمائی اور فکری بصیرت ہے۔ مزید برآں، انہوں نے علم کو اس نور سے تعبیر کیا ہے جو نفسِ مطمئنہ کو نفسِ امارہ پر حاکم بنا دیتا ہے، یعنی اصل علم وہ ہے جو انسان کو برائی سے روکے اور خیر کی طرف مائل کرے۔ یہاں علم کی روحانی و اخلاقی جہت پر زور دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کا یہ انعام صرف انبیاء تک محدود نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو صبر، طہارت اور استقامت کو اپنائے، اس انعام سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

[1] تبیان القرآن، ج۵، ص۲۸۹

تبیان القرآن میں غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ نے "علم" کے بارے میں مزید تحقیقی پہلو بیان کیے ہیں۔ انہوں نے اشدہ (پختگی) کی عمر کے مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد واضح کیا کہ قرآن نے عمر کو متعین نہیں کیا بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ جب انسان کی صلاحیتیں اپنے کمال کو پہنچتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو علم و حکمت سے نوازتا ہے۔ انہوں نے "حکم" اور "علم" کی تفسیری آراء نقل کرتے ہوئے بتایا کہ بعض مفسرین کے نزدیک "حکم" عقل و فقہ ہے اور "علم" خوابوں کی تعبیر یا شریعت کے احکام کا علم ہے۔ امام رازی کے حوالے سے یہ بھی ذکر کیا کہ "حکم" سے مراد حکمتِ عملی اور "علم" سے مراد حکمتِ نظریہ ہے، یعنی ایک وہ علم جو انسان کو اعمالِ صالح کی طرف لے جائے اور دوسرا وہ علم جو کائنات اور حقیقت کے ادراک پر مبنی ہو۔ سعیدی صاحب نے یہ بھی وضاحت کی کہ یوسف علیہ السلام کو پہلے عملی صبر کے امتحان سے گزارا گیا اور پھر ان پر علمی مکاشفات کے دروازے کھولے گئے۔ اس سے یہ اصول سامنے آتا ہے کہ حقیقی علم محض فکری نہیں بلکہ عملی ریاضت کے بعد عطا ہوتا ہے۔

ان تینوں تفاسیر کا تجزیاتی مطالعہ یہ حقیقت اجاگر کرتا ہے کہ قرآن کے نزدیک علم ایک جامع حقیقت ہے جو نبوت، شریعت، حکمت اور روحانی بصیرت کو محیط ہے۔ معارف القرآن نے اس کی بنیاد نبوت اور وحی کے ساتھ جوڑی، ضیاء القرآن نے اسے حکمت اور اخلاقی اصلاح کے ساتھ ملایا، جبکہ تبیان القرآن نے اس کے فلسفیانہ اور عملی پہلوؤں کو واضح کیا۔ نتیجتاً یہ بات سامنے آتی ہے کہ علم محض معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسا نور ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو عطا کرتا ہے تاکہ وہ نہ صرف اپنی زندگی کو بلکہ دوسروں کی حیات کو بھی روشنی اور ہدایت سے منور کر سکیں۔ یہی علم انسان کو اللہ کا قرب اور زمین پر قیادت عطا کرتا ہے اور یہی قرآن کے مطابق "محسنین" کا اصل انعام ہے۔

توکل منتخب تفاسیر کی روشنی میں

توکل کا لفظی معنی

کسی معاملہ میں کسی ذات پر اعتماد کرنا ہے یعنی آپ نے عاجزی کا اظہار اور دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ کرنا توکل کہلاتا ہے اس یقین کے ساتھ اسباب اختیار کرنا کہ دنیاوی تمام مادیات میں نفع ونقصان کی مالک صرف اور صرف اللہ کی ذات ہے اس کے حکم کے بغیر کوئی پتہ درس ہی نہیں گر سکتا ہر چھوٹی بڑی چیز اپنی وجود اور بقا کے لیے اللہ کے محتاج ہے۔

غرض خالق کائنات کی ذات باری تعالی پر مکمل اعتماد کر کے دنیا میں اسباب اختیار کرنا توکل ہے اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اسے مرض سے شفایابی کے لیے دوا کا استعمال تو کرنا ہے لیکن اس یقین کے ساتھ کہ جب تک اللہ تعالی شفا نہیں دے گا دوا اثر نہیں کر سکتی یعنی دنیا میں اس بات کو اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں بلکہ اللہ تعالی کا نظام یہی ہے کہ بندہ دنیاوی اسباب اختیار کر کے کام کے انجام دہی کے لیے اللہ تعالی کی ذات پر پورا بھروسہ کرے یعنی یقین رکھیں کہ جب تک حکم خداوندی نہیں ہو گا اسباب اختیار کرنے کے باوجود شفا نہیں مل سکتی۔

حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا بغیر باندھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا باندھو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔[1]

توکل کا مفہوم

توکل کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے تمام معاملات کو سرانجام دینے کے لیے اسباب وتدابیر اختیار کرتے ہوئے ان کی کامیابی کے لیے صرف اللہ تعالی پر بھروسہ کیا جائے اور ان معاملات کا انجام اس کے سپرد کر دیا جائے یعنی اصل اعتماد بھروسہ اور دل کا سہارا اختیار کردہ ذرائع واسباب پر نہ ہو بلکہ خدا کی ذات پر ہو جو اللہ تعالی پر توکل کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کے تمام معاملات میں اسے کافی ہو جاتا ہے۔

توکل کی اہمیت

توکل انسان کو سکون اور اطمینان کی حالت میں رکھتا ہے جب انسان جانتا ہے کہ اس کی محنت اور کوشش کے بعد تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں تو وہ دل وہ دماغ کی راحت محسوس کرتا ہے اور پریشانیاں کا سامنا بہادری سے کرتا ہے توکل انسان کو اس بات کی یاددہانی کراتا ہے کہ اللہ کا فیصلہ ہمیشہ بہتر ہوتا ہے اور انسان کا کام صرف کوشش کرنا ہے نتائج اللہ پر چھوڑ دینے ہیں اخر کار توکل ایک ایمان کی حالت ہے جس میں انسان اللہ کے فیصلے پر مکمل بھروسہ رکھتا ہے اور اس کی زندگی کے تمام فیصلے اسی اعتماد کے تحت کیے جاتے ہیں۔

[1] سنن ترمذی ج۴ ص ۶۷۰

توکل کی حقیقت

توکل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ کی رضا اور قدرت پر یقین رکھے اور اپنی تمام پریشانیوں اور مشکلات میں اللہ سے مدد طلب کرے توکل ایک اہم جز یہ ہے کہ انسان اللہ کی حکمت اور فیصلے پر راضی رہے چاہے نتائج اس کی خواہش کے مطابق ہو یا نہ ہو اس کی ایک مثال حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کی وہ حدیث جس میں فرمایا توکل کا مطلب یہ نہیں کہ تمہیں محنت کرنا چھوڑ دینا چاہیے بلکہ تم جو بھی کام کرو اللہ پر اس کا انعام اور کامیابی کا بھروسہ رکھو توکل ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کو سکون اور اطمینان فراہم کرتی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ کی مدد ہمیشہ اس کے ساتھ ہے۔

توکل منتخب تفاسیر کی روشنی میں

معارف القرآن

قولہ تعالی: قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۔[1]

ترجمہ: کہا ہر گز نہ بھیجوں گا اس کو تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دو مجھ کو عہد خدا کا البتہ پہنچا دو گے اس کو میرے پاس مگر یہ کہ گھیرے جاؤ تم سب پھر جب دیا اس کو سب نے عہد بولا اللہ ہماری باتوں پر نگہبان ہے۔

خلاصہ تفسیر: حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ خیر اس حالت میں بھیجنے سے انکار نہیں لیکن اس وقت تک ہر گز تمہارے ہمراہ نہ بھیجوں گا جب تک کہ اللہ کی قسم کھا کر مجھ کو پکا قول نہ دو گے کہ تم اس کو ضرور لے ہی آؤ گے ہاں اگر کہیں گھیر ہی جاؤ تو مجبوری ہے چنانچہ سب نے اس پر قسم کھالی سو جب وہ قسم کھا کر اپنے باپ کو قول دے چکے تو انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ جو بات چیت کر رہے ہیں یہ سب اللہ کے حوالے ہے یعنی وہی ہمارے قول و اقرار کا گواہ ہے کہ سن رہا ہے اور وہی اس قول کو پورا کر سکتا ہے پس اس کہنے سے دو غرض ہوئے اول ان کو اپنے قول کے خیال رکھنے کی ترغیب اور تنبیہ کہ اللہ کو حاضر ناظر سمجھنے سے بات ہوتی ہے اور دوسرے اس تدبیر کا منتہی تقدیر کو قرار دینا کہ توکل کا حاصل ہے اور اس کے بعد بنیامین کو ہمراہ جانے کی اجازت دے دی غرض دوبارہ مصر کے سفر کو مع بنیامین سب تیار ہو گئے۔[2]

مفتی شفیع صاحب نے خلاصہ تفسیر کے بعد یہ ذکر کیا ہے کہ جب انہوں نے اپنے والد کو عہد وہ پیمان دیا اور ساتھ ایک استثنا بھی لگا دیا اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ یعنی بجز اس صورت کے کہ تم سب کسی گھیرے میں آجاؤ امام تفسیر مجاہد نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ اور قتادہؒ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ تم بالکل عاجز اور مغلوب ہو جاؤ پھر آخر میں یعقوب علیہ السلام نے فرمایا اس سب معاملے کا بھروسہ اللہ تعالی ہی پر ہے۔[3] اس کے بعد مفتی صاحب نے ہدایات و مسائل کے ضمن میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ کسی انسان کے وعدے اور حفاظت پر

---

[1] یوسف ۱۲:۱۸

[2] معارف القرآن، ج۵، ص۱۰۲

[3] معارف القرآن، ج۵، ص۱۰۴

حقیقی طور سے بھروسہ کرنا غلطی ہے اصل بھروسہ صرف اللہ تعالی پر ہونا چاہیے وہی حقیقی کارساز اور مسبب الاسباب ہے اسباب کو مہیا کرنا پھر ان میں تاثیر دینا سب انہی کی قدرت میں ہے اسی لیے یعقوب علیہ السلام نے فرمایافَاللّٰہُ خَیۡرٌ حٰفِظًا آگے مفتی صاحب نے اس آیت کی تحقیق میں دو مسئلے ذکر کیے ہیں وہ یہ ہے:-

مسئلہ نمبر 1۔ کسی شخص کو ایسی قسم دینا نہیں چاہیے جس پر پورا کرنا بالکل اس کے قبضے میں نہ ہو جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو صحیح سالم واپس لانے کی قسم دی تو اس میں سے اس حالت کو مستثنی کر دیا کہ یہ بالکل عاجز و مجبور ہو جائے یا خود بھی سب ہلاکت میں پڑ جائے اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اپنی اطاعت کا عہد لیا تو خود اس میں استطاعت کی قید لگادی یعنی جہاں تک ہماری قدرت و استطاعت میں داخل ہے ہم اپ کی پوری اطاعت کریں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ مفتی صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ برادران یوسف سے عہد و پیمان لینا کہ وہ بنیامین کو واپس لائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفالت بالنفس جائز ہے یعنی کسی مقدمہ میں ماخوذ انسان کو مقدمہ کی تاریخ پر حاضر کرنے کی ضمانت کر لینا درست ہے اس مسئلے میں امام مالک رحمہ اللہ کا اختلاف ہے وہ صرف مالی ضمانت کو جائز قرار دیتے ہیں نفس انسانی کی ضمانت جائز نہیں رکھتے ہیں باقی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے۔

قولہ تعالی: وَ قَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدۡخُلُوۡا مِنۡۢ بَابٍ وَّ احِدٍ وَّ ادۡخُلُوۡا مِنۡ اَبۡوَابٍ مُّتَفَرِّقَۃٍ ؕ وَ مَاۤ اُغۡنِیۡ عَنۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ۚ وَ عَلَیۡہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ۔[1]

قولہ تعالی: وَ لَمَّا دَخَلُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَمَرَہُمۡ اَبُوۡہُمۡ ؕ مَا کَانَ یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ اِلَّا حَاجَۃً فِیۡ نَفۡسِ یَعۡقُوۡبَ قَضٰىہَا ؕ وَ اِنَّہٗ لَذُوۡ عِلۡمٍ لِّمَا عَلَّمۡنٰہُ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔[2]

ترجمہ: اور کہا اے بیٹو نہ داخل ہونا ایک دروازے سے اور داخل ہونا کئی دروازوں سے جدا جدا اور میں نہیں بچا سکتا تو تم کو اللہ کی کسی بات سے حکم کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر مجھ کو بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔[3]

ترجمہ: اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے کچھ نہیں بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر ایک خواہش تھی یعقوب کے جی میں سو پوری کر چکا اور وہ تو خبر دار تھا جو کچھ ہم نے سکھایا اس کو لیکن بہت لوگوں کو خبر نہیں۔[4]

خلاصہ تفسیر: اور چلتے وقت یعقوب علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اے میرے بیٹو اور جب مصر میں پہنچو تو سب کے سب ایک ہی دروازے سے مت جانا بلکہ الگ الگ دروازہ سے جانا اور یہ محض ایک تدبیر ظاہری ہے بعض مکروہات مثل نظر بد وغیرہ سے بچنے کی باقی خدا کے حکم کو تم پر سے میں ٹال نہیں سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو

---

[1] یوسف ۱۲:۶۷

[2] یوسف ۱۲:۶۸

[3] معارف القرآن صفحہ نمبر ۱۰۶ تا ۱۱۲ آیت نمبر ۶۷

[4] ایضا صفحہ نمبر ۱۰۶ تا ۱۱۲ آیت نمبر ۶۸

بھروسہ رکھنا چاہیے یعنی تم بھی اسی پر بھروسہ رکھنا تدبیر پر نظر مت کرنا غرض سب رخصت ہو کر چلے اور جب مصر پہنچ کر جس طرح ان کے باپ نے کہا تھا اسی طرح شہر کے اندر داخل ہوئے تو باپ کا ارمان پورا ہو گیا باقی ان کے باپ کو ان سے یہ تدبیر بتلا کر خدا کا حکم ٹالنا مقصود نہ تھا تاکہ ان پر کسی قسم کا اعتراض یا اس تدبیر کے نافع نہ ہونے سے ان پر شبہ لازم ائے چنانچہ خود انہوں نے ہی فرمادیا تھا وَ مَا اُغْنِیْ عَنْکُمْ لیکن یعقوب علیہ السلام کے جی میں درجہ تدبیر میں ایک ارمان آیا۔ جس کو انہوں نے ظاہر کر دیا اور وہ بلاشبہ بڑے عالم تھے بایں وجہ کہ ہم نے ان کو علم دیا تھا وہ علم کے خلاف تدبیر کو اعتقاداً موثر حقیقی کب سمجھ سکتے تھے صرف ان کے اس قول کی وجہ سے وہی عملاً ایک تدبیر کا ارتکاب تھا جو کہ مشروع و محمود ہے لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے بلکہ جہل سے تدبیر کو مؤثر حقیقی اعتقاد کر لیتے ہیں۔[1]

تحقیق: ان دو آیات کی تفسیر میں مفتی صاحب نے تین اہم باتیں ذکر کی ہیں نمبر ایک نظر بد نمبر دو حسد اور نمبر تین توکل کے متعلق۔

1۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے جب دوسری مرتبہ سفر پر جارہے تھے مصر تو ان کے ایک خاص وصیت کی کہ آپ لوگوں نے شہر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا۔

2۔ متفرق داخل ہونا سب اور وجہ اس وصیت کی یہ تھی کہ ان کو اندیشہ تک کہ یہ ماشاءاللہ سب نوجوان اور صحت مند ہیں صاحب جمال و صاحب وجاہت ہیں ایسا نہ ہو کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ سب ایک باپ کی اولاد ہے اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بد نظر کی نظر لگ جائے جس سے ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے یا اجتماعی طور پر داخل ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ حسد کرنے لگے اور تکلیف پہنچائے یہ تھی وجہ وصیت کی۔

نظر بد کا اثر:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی ہے ایک حدیث میں ہے کہ نظر بد ایک انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہانڈی میں داخل کر دیتی ہے اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی اور امت کو پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ان میں من کل عین لامہ مذکور ہے یعنی میں پناہ مانگتا ہوں نظر بد سے۔[2]

اس کے بعد مفتی صاحب نے ایک اور حدیث ذکر کی ہے نظر بد کے اثر کے متعلق جس میں صاحب سہل بن حنیف کا واقعہ مذکور ہے اور اس پر نظر بد لگ گئی عامر بن ربیعہ کا جسکی وجہ سے اس کو بخار چڑھ گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور علاج یہ ذکر کہا کہ عامر بن ربیعہ کا غسالہ اس پر ڈالا جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا ایسا کیا گیا وہ ٹھیک ہو گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ ماشاءاللہ کہنا چاہیے تھا اور برکت کی دعا اس حدیث سے نظر بد کے علاج کے لیے تین چیزیں بطور خاص ثابت ہوئی نمبر ایک غسالہ نظر لگانے والے کا نمبر دو ماشاءاللہ کہنا اور نمبر تین برکت کی دعا کرنا۔

مفتی صاحب بحوالہ قرطبی یہ ذکر کرتے ہیں کہ تمام علماء امت اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نظر بد لگ جانا اور اس سے نقصان پہنچ جانا حق ہے۔

---

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۱۰۸

[2] محمد ناصر الدین الالبانی، صحیح الجامع الصغیر وزیادتہ، المکتبہ الاسلامی بیروت، الطبعہ الثالث ۱۹۸۸، ص۲۵۰

وَ مَا أُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ اس آیت میں توکل کے متعلق ذکر ہے

اس آیت میں یہ مذکور ہے یعقوب علیہ السلام بیان فرمارہے ہیں کہ میں نے نظر بد سے بچنے کی جو تدبیر بتلائی میں جانتاہوں کہ وہ اللہ تعالی کے مشیت اور ارادے کو نہیں ٹال سکتی حکم تو اللہ ہی کا چلتاہے البتہ انسان کو ظاہری تدبیر کرنے کا حکم ہے۔

مذکورہ دو آیتوں کے ذیل میں مفتی شفیع صاحب نے چند مسائل اور احکام ذکر کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہے:

نمبر 1 یہ کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے اس سے بچنے کی تدبیر کرنا اسی طرح مشروع اور محمود ہے جس طرح مضر غذا اور مضر افعال سے بچنے کی تدبیر کرنا۔

نمبر 2 یہ کہ لوگوں کے حسد سے بچنے کے لیے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کو لوگوں سے چھپانا درست ہے۔

نمبر 3 یہ کہ مضر آثار سے بچنے کے لیے ظاہری اور مادی تدبیریں کرنا توکل اور شان انبیاء کے خلاف نہیں۔

نمبر 4 یہ کہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے بارے میں کسی تکلیف کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس کو آگاہ کر دے اور اندیشے سے بچنے کی ممکن تدبیر بتلا دے جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا۔

نمبر 5 یہ کہ جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا کوئی کمال یا نعمت تعجب انگیز معلوم ہو اور خطرہ ہو کہ اس کو نظر بد لگ جائے گی تو اس سے اس پر واجب ہے کہ اس کو دیکھ کر بارک اللہ یا ماشاء اللہ کہہ لے تاکہ دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

نمبر 6 یہ کہ نظر بد سے بچنے کے لیے ہر ممکنہ تدبیر کرنا جائز ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی دعا اور تعویز وغیرہ سے علاج کیا جائے جیسے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے دو لڑکوں کو کمزور دیکھ کر اس کی اجازت دی کہ تعویز وغیرہ کے ذریعے ان کا علاج کیا جائے۔

نمبر 7 یہ کہ دانشمند مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر کام میں اصل بھروسہ توکل تو اللہ تعالی پر رکھے مگر ظاہری اور مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہ کرے جس قدر جائز اسباب اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس کو اختیار میں ہوں ان کو بروئے کار لانے میں کوتاہی نہ کریں جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تعلیم فرمائی ہے یہی پیغمبرانہ توکل اور سنت رسول ہے۔

تفسیر ضیاء القرآن

پیر کرم شاہ الازہری صاحب نے بھی ان آیات کی تحقیق و تشریح میں مذکورہ باتیں ذکر کی ہیں یعنی نظر بد حسد اور اس سے بچنے کی تدبیریں لیکن نظر بد کے بارے میں جو حدیث ذکر کی ہے وہ یہ ہے۔[1]

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: العَیْنُ تُدْخِلُ الرَّجُلَ القَبْرَ، وتُدْخِلُ الجَمَلَ القِدْرَ[2]

[1] معارف القرآن، آیت ٦٧ , جلد ۳ ص ۴۴۳

[2] رواه أبو نعيم في الحلية وابن عدي في الكامل بإسناد حسنه الألباني في صحيحه ۱۲۴۹

یہ حدیث معارف القرآن میں بھی مذکور ہے کہ جس طرح نظر بد انسان کو قبر میں پہنچاتی ہے اور اونٹ کو ہانڈی میں اور ساتھ نظر بد سے بچنے کی دعا اور کلمات بھی مذکور ہیں اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللہِ التَّامَّۃِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَ ھَامَّۃٍ وَّ مِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّامَّۃٍ۔[1]

اسی طرح جب کوئی چیز دیکھ لے اور اسے پسند ائے تو کہے تَبَارَکَ اللہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ اللّٰھم بَارِکْ فیه۔[2]

آخر میں توکل کے متعلق ذکر کیا ہے کہ پہلے یعقوب علیہ السلام نے امر مکروہ سے بچنے کی ایک تدبیر بتادی لیکن ساتھ ہی یہ تنبیہ فرمادی کہ اللہ کی تقدیر کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں یہ تدبیر اسی وقت تک کارگر ثابت ہوسکتی ہے جب اذن الہی ہو اسی کا فرمان اٹل ہے اور ہم سب کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کو اس لیے صاحب علم کہا گیا کہ آپ کو اس بات کا یقین محکم تھا کہ اذن الہی کے بغیر کوئی تدبیر کا اثر کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔ اور اس کی کوئی احتیاط اسے تقدیر کے فیصلے سے نہیں بچاسکتی۔ آپ فرماتے ہیں۔ فَاعْلَمْ أَنَّ إِنْسَانَ مَأْمُورٌ بِأَنْ یرَاعی الْأَسْبَاب الْمُعْتَبَرة فی ھذَا الْعَالِمِ و مَأْمُور ایضا بِأَنْ یعتَقَد وَ یحزْمٍ بِأَنَّه لَا یصَلّ الیه إِلَّا مَا قَدَرَہ اللہ تَعَالی وَ الحَذَر ینَجّی مِنْ الْقَدْرِ۔

تفسیر تبیان القرآن

علامہ غلام رسول احمد سعیدی صاحب نے جو تحقیق کی ہے وہ ان دو آیات کے متعلق درج ذیل ہے:

نمبر 1۔ نظر لگنے کے متعلق احادیث۔

2۔ نظر بد میں مذاہب اور اس سے متعلق شرعی احکام۔

3۔ نظر بد کی تاثیر کی تحقیق۔[3]

1۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی یہ دس بیٹے بہت خوبصورت اور بہت باکمال تھے مصر کے چار دروازے تھے جب دس بیٹے مصر روانہ ہونے لگے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ خدشہ ہوا کہ اگر 10 کے 10 ایک دروازے سے داخل ہوئے تو ان پر دیکھنے والوں کی نظر لگ جائے گی اس لیے انہوں نے فرمایا اے میرے بیٹوں تم سب ایک دروازے سے مت داخل ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا۔[4]

نظر لگنے سے متعلق احادیث۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نظر برحق ہے اور آپ نے گورنے سے منع فرمایا۔[5] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نظر بد کے دم کرانے کا حکم دیا تھا۔[6] اسی طرح ایک اور حدیث کا واقعہ بھی مذکور ہے جو معارف القرآن میں بھی موجود ہے سہل بن حنیف رضی اللہ تعالی عنہ کا جس پر عامر بن ربیعہ کا نظر لگ گیا تھا

[1] بخاری، ح ۳۳۷۱

[2] القرطبی، ابوعبداللہ، الجامع لأحکام القرآن الشہیر بتفسیر القرطبی، دار الکتب المصریۃ، قاہرہ، ۱۹۶۷، جلد 9، ص ۲۲۶

[3] تبیان القرآن، ج۵، ص ۸۱۰

[4] تبیان القرآن، ج۵، ص ۸۱۰

[5] صحیح بخاری، ح ۵۷۴۰

[6] صحیح بخاری، ح ۵۷۳۸

وہ حدیث اس میں بھی موجود ہے۔

2۔ نظر بد میں مذاہب اور اس سے متعلق شرعی احکام ان احادیث میں یہ تصریح ہے کہ نظر کا لگنا برحق ہے اور نظر کبھی انسان کو قتل بھی کر دیتی ہے جیسے کہ موت کی اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تم اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتے ہو اس پر تمام امت کے علماء کا اجماع ہے اور یہی اہل سنت کا مذہب ہے علامہ صاحب نے اخر میں ذکر کیا ہے بعض احادیث میں نظر لگ جانے کے بعد دم کرانے کا ارشاد ہے اور بعض احادیث میں جس کی نظر لگی اس کو غسل کرا کر اس کے غسالہ کو اس پر ڈالنے کا حکم ہے جس پر نظر لگی ہے اس میں تطبیق اس طرح ہے کہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کس کی نظر لگی ہے تو دم کرایا جائے اور اگر یہ معلوم ہو کہ فلاں شخص کی نظر لگی ہے تو اس کو غسل کرنے کا حکم دیا جائے اور اسکا غسالہ جس پر نظر لگی ہے ڈال دیا جائے۔[1]

3۔ نظر بد کی تاثیر کی تحقیق بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کسی شخص کے دیکھنے سے دوسرے شخص کو ضرر کیوں کر پہنچتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ لوگوں کی طبائع اور ان کے بدنوں کی کیفیت مختلف ہوتی ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کی انکھ سے زہر نکل کر دوسرے کی بدن میں پہنچ جاتا ہے اس کی نظیر یہ ہے کہ جس شخص کے اشوب چشم ہو اور تندرست ادمی اس کو دیکھے تو اس کو بھی بیماری لگ جاتی ہے اس طرح بعض بیماریوں میں تندرست آدمی بیمار کے پاس بیٹھے تو اس کو وہ بیماری لگ جاتی ہے جیسے موجودہ دور میں کرونا تھا یہاں پر علامہ صاحب نے اور مثالیں بھی دی ہیں تاثیرات کے جن کو طوالت کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا۔

خلاصہ بحث

قرآن مجید میں توکل کو ایمان کی بنیادی علامت اور مومن کی عملی زندگی کا ایک اہم پہلو قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ یوسف میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو واقعات میں توکل کی عملی صورت سامنے آتی ہے۔ ایک موقع پر جب برادرانِ یوسف نے بنیامین کو ساتھ لے جانے کی درخواست کی تو آپ نے ان سے اللہ کے نام پر پختہ عہد لیا اور فرمایا کہ اصل معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، وہی ہمارے اقوال کا گواہ اور نگران ہے۔ دوسرے موقع پر جب آپ نے بیٹوں کو مصر روانہ کیا تو نصیحت فرمائی کہ سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا تاکہ نظر بد اور حسد کے اثرات سے محفوظ رہو۔ تاہم ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ تدبیر اللہ کے فیصلے کو نہیں بدل سکتی، فیصلہ تو صرف اسی کا چلتا ہے، اور میرا بھروسہ اسی پر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ظاہری تدابیر ضرور اختیار کرتے تھے لیکن اپنے دل کا مکمل اعتماد صرف اللہ کی ذات پر رکھتے تھے۔

معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے ان آیات کی روشنی میں توکل کی جامع تشریح کی ہے۔ ان کے نزدیک حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کے معاملے میں اپنے بیٹوں سے عہد لیا، مگر ساتھ ہی یہ شرط لگائی کہ اگر وہ سب مغلوب ہو جائیں یا ہلاک ہو جائیں تو اس میں ان کا قصور نہیں ہو گا۔ اس سے یہ اصول اخذ کیا کہ کسی وعدے یا قسم کو اس صورت میں لازم نہیں قرار دینا چاہیے جس پر پورا کرنا انسان کے اختیار میں نہ ہو۔ ساتھ ہی یہ وضاحت کی کہ حقیقی بھروسہ کسی انسان یا ظاہری تدبیر پر نہیں بلکہ صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے، وہی مسبب

[1] تبیان القرآن ص ۸۱۲

الاسباب اور حقیقی کارساز ہے۔ معارف القرآن نے نظر بد اور حسد سے بچنے کی تدابیر کو بھی جائز قرار دیا، مگر اس پر زور دیا کہ یہ سب تدبیریں توکل کے منافی نہیں، بلکہ اصل توکل یہ ہے کہ انجام کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ یعقوب علیہ السلام کا یہ رویہ اس بات کی عملی مثال ہے کہ تدبیر اور توکل ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ نے توکل کو تدبیر اور تقدیر کے درمیان توازن کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کو دنیاوی اسباب اور ظاہری تدابیر کو اختیار کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، لیکن ساتھ ہی اسے یہ یقین بھی رکھنا چاہیے کہ یہ تدبیریں اللہ کی مشیت اور اذن کے بغیر کارگر ثابت نہیں ہوتیں۔ پیر کرم شاہ نے امام رازی کے حوالے سے یہ نکتہ بیان کیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو "صاحبِ علم" اس لیے کہا گیا کہ وہ اس حقیقت پر کامل یقین رکھتے تھے کہ کوئی بھی تدبیر اللہ کے حکم کے بغیر مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک توکل صرف زبان یا نیت کا نام نہیں بلکہ ایمان کی گہرائی میں رچا بسا ایک یقین ہے کہ ہر معاملہ آخرکار اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اس تصور کے مطابق، تدبیر اختیار کرنا ایمان کا تقاضا ہے لیکن تدبیر کو مؤثرِ حقیقی سمجھنا توکل کے منافی ہے۔

تبیان القرآن میں علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ نے توکل کے ساتھ ساتھ نظر بد کے موضوع کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے، کیونکہ یعقوب علیہ السلام کی وصیت اسی خدشے سے متعلق تھی۔ انہوں نے نظر بد کے بارے میں متعدد احادیث ذکر کیں، جیسے سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کا واقعہ جس پر نظر لگ گئی تھی۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ نظر بد سے بچنے کے لیے دم، دعا اور تعویذ جیسی تدبیریں جائز ہیں۔ تاہم، اصل زور اس بات پر دیا کہ یہ تدابیر محض اسباب ہیں، حقیقی حفاظت اللہ کی قدرت سے ہے۔ توکل کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ ظاہری اسباب کو اپنائے مگر انہیں مؤثرِ حقیقی نہ سمجھے۔ علامہ سعیدی نے اس پہلو کو بھی نمایاں کیا کہ انبیاء علیہم السلام کی عملی زندگی سے یہی سبق ملتا ہے کہ مومن کو اپنے اختیار میں آنے والی تدابیر ضرور اپنانی چاہییں، لیکن اس کے بعد دل کو مکمل سکون کے ساتھ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہی سنتِ انبیاء ہے اور یہی پیغمبرانہ توکل ہے۔

تینوں تفاسیر کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ توکل دو بنیادی عناصر پر مشتمل ہے: پہلا یہ کہ انسان اپنی طاقت اور عقل کے مطابق جائز تدابیر اختیار کرے؛ دوسرا یہ کہ ان تدابیر کو اصل سبب نہ سمجھے بلکہ اللہ کی مشیت کے تابع جانے۔ معارف القرآن نے توکل کے پہلو کو وعدے اور بھروسے کے تناظر میں اجاگر کیا، ضیاء القرآن نے تقدیر و تدبیر کے توازن پر روشنی ڈالی، جبکہ تبیان القرآن نے نظر بد اور اسباب کی تفصیل بیان کر کے واضح کیا کہ توکل کا مطلب اسباب کو ترک کرنا نہیں بلکہ انہیں اللہ کی مشیت کے تابع ماننا ہے۔ یوں قرآن کے تصورِ توکل کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ مومن کے لیے نہ صرف یہ لازم ہے کہ وہ اپنی کوشش کرے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دل کا کامل سکون اور اعتماد صرف اور صرف اللہ کی ذات پر رکھے۔ یہی کامل ایمان اور توکل کا تقاضا ہے۔

رجوع الی اللہ منتخب تفاسیر کی روشنی میں

رجوع الی اللہ کا مطلب

رجوع الی اللہ کی اصطلاح عرف میں اللہ تعالی کی طرف توبہ واستغفار کے ذریعے رجوع کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے لہذا مومن کے لیے جب رجوع الی اللہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کا اپنے پچھلے گناہوں سے معافی مانگنا اور حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اس پر جو ذمہ عائد ہوتے ہیں اس کی تلافی کی نیت کرنا اور آئندہ زندگی میں فرائض واجبات ادا کرنے اور حرام چیزوں سے بچنے کی پابندی نیز سنن نوافل ادا کرنے اور مکروہات سے بچنے کا اہتمام کرنے کی نیت کرنا اور غیر مسلم کے لیے رجوع الی اللہ کا لفظ استعمال ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ اپنی گزشتہ نافرمانی اور کفر وشرک والی زندگی سے تائب ہو کر اللہ تعالی اور اس کے احکامات کی طرف لوٹنا، البتہ قرآن مجید میں رجوع الی اللہ کا لفظ ایک اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی جب کائنات کی چیزوں کے متعلق رجوع الی اللہ کا لفظ بولا جائے تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں اگرچہ ظاہری طور پر انسانوں کی حکومت اور دنیاوی چیزوں کا انسانوں کی ملکیت میں ہونا نظر اتا ہے لیکن ایک وقت ائے گا یعنی اخرت میں جب انسان کی یہ تمام ظاہری اختیارات بھی ختم ہو جائیں گے اور ہر چیز صرف اللہ کے حکم اور اختیار میں چلی جائے گی۔

توبہ کا لغوی معنی ہے رجوع کرنا اور اصطلاح میں گناہ چھوڑنا اس پر ندامت دوبارہ نہ کرنے کا عزم اور اگر کسی کا حق ہو تو واپس کرنا یا معاف کرانا اللہ پاک کا حکم ہے کہ اے ایمان والو خالص اور سچی توبہ کرو۔[1]

توبہ کا حکم

گناہوں سے توبہ کرنا بلا تاخیر واجب ہے چاہے گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ توبہ امور اسلام میں ایک اہم ترین حکم ہے۔

توبہ کی شرائط اور ارکان

توبہ کی تین شرطیں ہیں نمبر ایک گناہ چھوڑنا نمبر دو معصیت پر ندامت نمبر تین ائندہ نہ کرنے کا عزم توبہ میں سب سے بڑا رکن ندامت ہے اگر حقوق العباد میں سے ہو تو ایک رکن بڑھ جاتا ہے نمبر چار صاحب حق کو ادا کرنا اور اس سے معافی مانگنا۔

رجوع الی اللہ وقت کی اہم ترین ضرورت

اللہ تعالی کا اپنے بندوں پر بڑا فضل اور احسان ہے اس کی نعمتیں بے پایاں کرم نوازیاں اور اپنی مخلوق کے ساتھ اس کے متعلق کی نوعیتیں ہر چار طرف بکھری ہوئی ہیں آپ نے آپ کو منواتی اور چار دانگ عالم میں محبت اور الفت کا پیغام لے کر آتی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں بندوں کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کے وہ بندے بھی جو بظاہر اس کو جانتے پہچانتے ہیں اس کی کبریائی کی گن گاتے اس کی بڑائی کو مانتے اس کے اول و آخر اور ملجا وماویٰ ہونے کو تسلیم کرتے مگر ان کے اعمال وافعال ان کے ایمان عقیدے اور ان کے ذہن وہ فکر کی نفی کر رہے ہوتے ہیں ادمی اگر دور نہ جائے اور خود اپنے اندر جھانک کر دیکھے تو یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر سامنے اجاتی ہے کہ بندگی کے راستے پر چلنے والے بھی

[1] سورہ تحریم آیت:۸

بار بار ڈگمگاتے راہ سے بہرا ہو جاتے ہیں منزل کو گم کر بیٹھتے ہیں اور خود اپنی ہی شناخت اور تعارف سے محروم ہو جاتے ہیں چنانچہ اس کے نتیجے میں یہ سوال اٹھتا ہے اور اٹھایا جانا چاہیے کہ ان اسباب و علل پر کیسے قابو پایا جائے جو بحیثیت مجموعی بندوں کی گمراہی اور اپنے رب سے دور ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

قرآن پاک اور آحادیث مبارکہ میں اس موضوع پر تفصیلی ہدایات موجود ہیں اور جزیات تک رہنمائی کی گئی ہے جہاں تک یہ بتایا گیا ہے کہ انسان ناشکرا واقع ہوا ہے بھول اور غفلت کا شکار ہو جاتا ہے سر سے لے کر پیر تک احسان فراموش بن جاتا ہے وہی حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کی فطرت اور اس کی جبلت میں رجوع کے اپنی طرف لوٹنے پلٹنے کے بھی کئی عنوانات ہیں اسی وجہ سے طبیعت اور مزاج میں ایک ندامت کی کیفیت اور ہر غلط کام کے اوپر اپنے آپ کو ٹوکنے کا ایک جذبہ ہمیشہ موجود رہتا ہے ہر برائی اور گناہ پر ملول ہونے تاسف کا اظہار کرنے اور طبیعت کے اندر ایک ہی جان کی کیفیت کی گئی حوالے سامنے اتے ہیں اسی کو توبہ و استغفار بھی کہا جاتا ہے اور رجوع الی اللہ بھی قرآن پاک میں اہل ایمان کی جو صفات بیان ہوئی ہیں انہوں نے پلٹنے والے لوٹنے والے اپنے رب کی طرف بار بار رجوع کرنے والے اور توبہ استغفار کرنے والے کا تذکرہ بار بار ملتا ہے اللہ تعالی کو اپنے بندی کی یہ ادا بے حد پسند ہے کہ وہ بار بار راہ سے بہرا ہو اور بار بار آپ نے رب کی طرف رجوع کرے اس کی طرف وآپس لوٹ آئے اور وہ اس کو معاف کر دے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم سب ملائکہ کی طرف بے گناہ ہو جاؤ اور تم سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو تو اللہ تعالی اور مخلوق پیدا کرے گا جس سے گناہ بھی سرزد ہوں گے اور پھر اللہ تعالی ان کی مغفرت کا فیصلہ فرمائے گا اور یوں اپنی شان غفاریت کا اظہار فرمائے گا۔[1]

توبہ استغفار کی قرآن کریم اور احادیث نبوی میں بے شمار فضیلت بیان کی گئی ہے اس حوالے سے ارشاد ربانی ہے اے ایمان والو تم اللہ کے سامنے سچی خالص توبہ کرو ممکن ہے تمہارا رب تمہارے گناہ دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں پہنچا دے جس کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں جس دن اللہ تعالی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان اہل ایمان کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے بیت القیر نہ کرے گا ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں بائیں دوڑ رہا ہو گا یہ دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں نور عطا فرما اور ہمیں بخش دے یقینا تو ہر چیز پر قادر ہے۔[2]

تفسیر معارف القرآن

آیت : **قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ-وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ-فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ-اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ-ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِیْنٍ**[3]

ترجمہ: یوسف علیہ السلام بولا اے رب مجھ کو قید پسند ہے اس بات سے جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہے اور اگر تو دفعہ نہ کرے گا مجھ سے ان کا فریب تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل۔ سو قبول کر لی اس کی دعا اس کے رب نے پھر دفع کیا اس سے ان کا فریب البتہ وہی سننے والا خبر دار ہے۔ پھر یوں سمجھ میں آیا لوگوں کی ان نشانیوں کے دیکھنے پر کہ قید رکھے اسکو ایک مدت۔

---

[1] صحیح مسلم، ج ۶۹۶۵

[2] تحریم ۶۶:۸

[3] یوسف ۱۲:۳۳، ۳۴

خلاصہ تفسیر: یوسف علیہ السلام نے یہ باتیں سنی کہ یہ تو سب کے سب اسی کی موافقت کرنے لگیں تو حق تعالی سے دعا کی کہ اے میرے رب جس ناجائز کام کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو جیل خانہ میں جانا ہی مجھ کو زیادہ پسند ہے اور اگر آپ ان کی داؤ پیچ کو مجھ سے دفع نہ کریں گے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانی کا کام کر بیٹھوں گا سو ان کی دعا ان کے رب نے قبول کی اور ان عورتوں کے داؤ پیچ کو ان سے دور رکھا بے شک وہ دعاؤں کا بڑا سننے والا اور ان کے احوال کا خوب جاننے والا ہے پھر یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کی مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد جن سے خود تو اس کا پورا یقین ہو گیا مگر عوام میں چرچا ہو گیا تھا اس کو قطع کرنے کی غرض سے ان لوگوں کو یعنی عزیز اور اس کے متعلقین کو یہی مصلحت معلوم ہوئی کہ ان کو ایک وقت تک قید میں رکھیں۔[1]

تشریح: اس آیت کریمہ میں تین باتیں قابل تحقیق ہیں نمبر ایک اے میرے رب مجھے جیل پسند ہے نمبر دو اگر آپ نے مجھ سے ان کا مکر دور نہ کیا نمبر تین ممکن ہے میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا پہلی بات یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جو یہ فرمایا کہ جیل خانہ مجھے پسند ہے کوئی قید و بند کی طلب یا خواہش نہیں کی بلکہ گناہ کے مقابلے میں اس دنیاوی مصیبت کو اسان سمجھنے کا اظہار ہے اور بعض روآیات میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام قید میں ڈالے گئے تو اللہ تعالی کی طرف سے وحی ائی کہ آپ نے قید میں اپنے آپ کو خود ڈالا ہے کیونکہ آپ نے کہا تھا **السجن احب الي** یعنی اس کی نسبت مجھ کو جیل خانہ زیادہ پسند ہے اور اگر آپ عافیت مانگتے تو آپ کو مکمل عافیت مل جاتی۔

مسئلہ اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑی مصیبت سے بچنے کے لیے دعا میں یہ کہنا کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ فلاں چھوٹی مصیبت میں مجھے مبتلا کر دے مناسب نہیں بلکہ اللہ تعالی سے ہر مصیبت اور بلا کے وقت عافیت ہی مانگنی چاہیے اس لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کی دعا مانگنے سے ایک شخص کو منع فرمایا کہ صبر تو بلا مصیبت پر ہوتا ہے تو اللہ تعالی سے صبر کی دعا مانگنے کے بجائے عافیت کی دعا مانگو ترمذی دوسری بات یہ فرمائی کہ اگر آپ ان کے مکر کو رفع نہ کریں گے تو ممکن ہے کہ میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں یہ عصمت نبوت کے خلاف نہیں کیونکہ عصمت کا تو حاصل ہی یہ ہے کہ اللہ تعالی کسی شخص کو گناہ سے بچائے تکوینی طور پر انتظام فرما کر اس کو گناہ سے بچالیں اور اگر بمقتضائے نبوت یہ مقصد پہلے ہی حاصل تھا مگر پھر بھی غایت خوف ادب سے اس کی دعا کرنے پر مجبور ہو گئے۔

مفتی شفیع رحمہ اللہ نے مذکرہ آیت سے دو مسئلے نکالے ہیں وہ درجہ ذیل ہیں:

مسئلہ نمبر ۱ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص بغیر خدا تعالی کے امداد و اعانت کے گناہ سے نہیں بچ سکتا۔

مسئلہ نمبر ۲ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر گناہ کا کام جہالت سے ہوتا ہے علم کا تقاضا گناہوں سے اجتناب ہے۔[2]

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ[3]

ترجمہ: ان کی دعا ان کے رب نے قبول فرمائی اور ان عورتوں کے مکر و حیلہ کو ان سے دور رکھا بے شک وہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔

تشریح: اللہ تعالی نے ان عورتوں کے جال سے بچانے کے لیے یہ سامان فرمایا کہ عزیز مصر اور اس کے دوستوں کو اگرچہ یوسف علیہ السلام کی بزرگی اور تقوی و طہارت کی کھلی نشانیاں دیکھ کر ان کی پاکی کا یقین ہو چکا تھا مگر شہر میں اس واقعہ کا چرچہ ہونے لگا اس کو ختم کرنے کے لیے ان کو

---

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۶۱

[2] عبد اللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، المکتبۃ العصریۃ بیروت، ج۵، ص ۱۲۲

[3] سورہ یوسف آیت: ۳۴

مصلحت اس میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لیے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بند کر دیا جائے تا کہ اپنے گھر میں ان شبہات کا کوئی موقع بھی باقی نہ رہے اور لوگوں کی زبانوں سے اس کا یہ چرچہ بھی ختم ہو جائے اس لیے اس کو جیل میں ڈال دیا گیا اور یہ کام مصلحتاً کیا۔

تفسیر ضیاء القرآن

قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِیْنٍ[1]

علامہ پیر کرم شاہ الازہری صاحب نے ان آیات کی تشریح میں جو لکھا ہے اس سے پہلے آیت میں یہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے ایک دعوت کی ضیافت کی جو بڑے بڑے لوگ تھے ان کی عورتوں کے لیے اور اس بات کو ان سے تسلیم کرانے کے لیے کہ جو میں کر رہی ہوں یہ صحیح ہے جب دعوت کی اور ساری عورتیں دستر خوان پر بیٹھ گئی تو پھر عزیز مصر کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو آواز دی کہ باہر آجاؤ جب باہر آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کو دیکھ کر انہوں نے پھلوں کی بجائے اپنی انگلیاں کاٹ دی اور عورتوں نے کہا یہ تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے جب ان عورتوں نے یہ بات کہی زلیخا کو موقع مل گیا اور بولنے لگی یہ ہے جس کے بارے میں مجھے آپ ملامت کیا کرتی تھی میں نے اس سے مطالبہ کیا لیکن وہ بچا ہی رہا اور اگر وہ یہ کام نہ کرلے جس کی میں حکم دیتی ہوں تو یہ ضرور جیل میں ڈالا جائے گا اور رسواؤں میں سے ہو جائے گا تب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ مذکورہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے التجا کی یا اللہ بچانے والا تو ہے آپ ہی میری مدد فرما ورنہ میں ان عیاریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا میرے قدم پھسل جائیں گے اور مجھ سے ایسا قصور سرزد ہو جائے گا کہ میرا شمار پھر صادقین اور مخلصین میں نہ ہو گا بلکہ جاہلوں میں ہونا لگے گا اس کے بعد دوسری آیت میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قبول کی اور ہر مرحلہ پر اس کو وہ ثبات اور پختگی عطا فرمائی کہ حسن عریاں کی کوئی یورش آپ کو متزلزل نہ کر سکی۔ تیسری آیت میں یہ مذکور ہے کہ اس ضیافت کے بعد حسن یوسف کے چرچے گھر گھر ہونے لگے اور نہ صرف زلیخا بلکہ سارے متمول گھرانوں کے رئیس زادیاں آپ کی محبت کا دم بھرنے لگیں تو حکومت کے ارباب نے پاک دامن اور بے گناہ یوسف کو قید کرنے میں مصلحت سمجھی۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ[2] کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو قطعاً بے گناہ سمجھتے تھے بجائے اس کے کہ گنہگاروں کو سرزنش کرتے اور انہیں معطوب گردانتے انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ہی قید کرنا اسان سمجھا نمبر پانچ اور ایک روایت میں ہے کہ زلیخا نے اپنے شوہر سے شکایت کی کہ اس کنعانی غلام نے مجھے بہت رسوا کر دیا جہاں جاتا ہے میرے متعلق توہین آمیز باتیں بناتا ہے اگر تمہیں اپنی عزت و ناموس کا کچھ پاس ہے تو اسے قید کر دو اس نے جانتے ہوئے کہ یوسف بے گناہ ہے اور سارا قصور اس کی بیوی کا ہے اس نے اپنی مجرم اور خائن بیوی کی پاسداری کے لیے ایک بے گناہ اور معصوم کو جیل میں بھیجنا گوارا کر لیا۔

اس آیت کے آخر میں **حتیٰ حین** مذکور ہے۔

---

[1] یوسف ۱۲: ۳۳، ۳۴

[2] یوسف: ۳۵

علامہ پیر کرم شاہ الازہری صاحب نے حین کی لغوی تحقیق ذکر کی ہے۔

لغت میں حین وقت کے ایک غیر معین عرصے کو کہتے ہیں اس کا اطلاق مختصر اور طویل عرصے پر یکساں ہوتا ہے اگرچہ اس مدت کو متعین کرنے کے لیے کئی اقوال موجود ہیں جو تبیان میں مذکور ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ اسے مقرر نہ کیا جائے۔

فَالصَّحِيحُ أَنَّ هَذِهِ الْمَقَادِيرِ غَيْرُ مَعْلُومَةٍ وَإِنَّمَا الْقَدْرُ الْمَعْلُومُ أَنَّهُ بَقِيَ مَحْبُوسًا مُدَّةً طَوِيلَةً[1]

و اشار اليه في تبيان القران

تبیان القرآن

یوسف علیہ السلام نے کہا اے میرے رب مجھے قید ہونا اس گناہ سے پسند ہے جس کی طرف مجھے یہ دعوت دیتی ہیں اور اگر تو نے ان کی سازش مجھ سے دور نہ کی تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں سے ہو جاؤں گا پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی اور ان کو عورتوں کی سازش سے محفوظ کر دیا بے شک وہ بہت سننے والا خوب جاننے والا ہے۔[2]

علامہ رسول سعیدی صاحب نے مذکورہ آیت کی تحقیق و تشریح میں یہ باتیں ذکر کی ہیں نمبر 1 گناہ سے بچنا اللہ کی اعانت سے ہوتا ہے نمبر 2 یوسف علیہ السلام کو قید کرنے کا سبب نمبر 3 حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی کی علامات نمبر 4 قید کی مدت:

1۔ یوسف علیہ السلام نے دعا میں جمع کا صیغہ استعمال کیا حالانکہ وہ تو ایک عورت تھی عزیز مصر کی بیوی اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا ایک محمل تو یہ ہے کہ یہ سب عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی اور محفل میں شریک عورتیں یہ چاہتی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام اس کی خواہش کو پورا کریں دوسرا محمل یہ ہے کہ وہ عورتیں مل کر عزیز مصر کی بیوی کی سفارش کر رہی تھی کہ تم نے اس کی خواہش پوری نہ کر کے اس پر ظلم کیا اس کی خواہش کو پورا کرنا چاہیے تھا۔[3]

امام فخر الدین محمد بن عمر الرازی متوفی 606 ہجری لکھتے ہیں اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں انواع و اقسام کے وسوسے تھے۔

نمبر 1۔ عزیز مصر کی بیوی بہت خوبصورت ہے۔
نمبر 2۔ وہ بہت مالدار اور بڑے مرتبہ کی ہے اور وہ یہ کہتی ہے کہ اگر تم نے میری خواہش پوری کر دی تو میں سب کچھ تم پر نچھاور کر دوں گی۔
نمبر 3۔ محفل میں شریک ہر عورت ان سے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی اور خواہش پوری نہ کرنے کی صورت میں ان کو دھمکیاں دے رہی تھی اور اس معاملے میں عورتوں کی سازشیں بہت سنگین ہوتی ہیں۔

---

[1] ضیاء القرآن ج، ۲ ص ۴۲۹
[2] سورہ یوسف ایت نمبر: ۳۴، ۳۳
[3] تبیان القرآن صفحہ نمبر ۷۴۷

نمبر 4۔ حضرت یوسف علیہ السلام ان عورتوں کے شر سے بہت خوفزدہ تھے ان کو یہ خطرہ تھا کہ اگر ان عورتوں کی بات نہ مانی تو وہ ان کو قتل کروا دیں گی۔[1]

اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے ذہن میں اس کام کی طرف ترغیب کی بھی وجوہات تھی اور کام نہ کرنے کی صورت میں ڈر اور خوف کی بھی وجوہات تھیں حضرت یوسف علیہ السلام کو ڈر تھا کہ گناہ کی تحریک کے یہ اسباب بہت قوی ہیں کہیں یہ ان کے پائے استقامت کو ڈگمگا نہ دیں اور بشری قوت اور انسانی طاقت ایسی قوی ترغیبات اور تحریکات کے مقابلے میں پاک دامنی پر برقرار رہنے کے لیے ناکافی ہے الا یہ کہ اللہ تعالی مدد فرمائے اور بندے کو گناہ کے تاریک گڑھے میں گرنے سے بچالے اس لیے انہوں نے اللہ تعالی کی بارگاہ میں دعا کی اے میرے رب مجھے قید ہونا اس گناہ سے پسند ہے جس کی طرف مجھے یہ دعوت دیتی ہیں اور اگر تو نے ان کی سازش مجھ سے دور نہ کی میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ قید میں گرفتار ہونا مشقت اور مصیبت ہے اور جو ان کا مطلوب تھا وہ سراسر لذت اور عیش تھا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اس عارضی لذت کا انجام دنیا کی رسوائی اور اخرت کا عذاب ہے اور انہوں نے دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب کے مقابلے میں قید کی مشقت اور مصیبت کو اختیار کر لیا اس لیے فرمایا مجھے قید ہونا اس گناہ سے پسند ہے جس کی طرف مجھے یہ دعوت دیتی ہیں۔ مذکورہ بحث سے تین قاعدے معلوم ہوئے۔

قاعدہ نمبر 1-اس سے یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ جب انسان دو مصیبتوں میں سے کسی ایک مصیبت میں لازما گرفتار ہو تو اسان مصیبت کو اختیار کر لے۔

قاعدہ نمبر 2۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اخرت کے عذاب کے مقابلے میں دنیا کی مصیبت اختیار کر لینی چاہیے۔

قاعدہ نمبر 3۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک اللہ تعالی کی عنایت شامل حال نہ ہو انسان کسی گناہ سے بچ سکتا ہے نہ کسی نیکی کو اختیار کر سکتا ہے۔[2]

پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی کی علامات دیکھنے کے باوجود ان کی پہلے رائے یہ ہوئی کہ وہ کچھ عرصہ کے لیے یوسف علیہ السلام کو ضرور قید کرا دیں۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے اس آیت کے اندر تین باتوں کا ذکر کیا ہے:

نمبر 1 حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کرنے کی وجہ نمبر 2 حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی کی علامات نمبر 3 اور قید کی مدت۔

نمبر 1 **قید کرنے کی وجہ:** جب عزیز مصر پر حضرت یوسف علیہ السلام کی تہمت سے براءت ظاہر ہو گئی تو واضح طور پر اس نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کوئی تعرض نہیں کیا لیکن عزیز مصر کی بیوی کی بدنامی سے بچنے کی خاطر عزیز مصر نے سوچا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے اس کو قید کر دیا جائے۔[3]

نمبر 2 **یوسف علیہ السلام کی پاک بازی کی علامات:** اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک بازی کی علامات کا ذکر ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک بازی کی علامات کا ذکر ہے وہ علامات مندرجہ ذیل ہیں:

---

[1] تبیان القرآن، ج۵، ص۴۸۷

[2] ایضا، ص۴۸۷

[3] جامع البیان جزبرا صفحہ ۲۰۷۹

نمبر ا حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص پیچھے سے پھٹا ہوا ہونا۔

نمبر ۲ حضرت یوسف علیہ السلام کا اس عورت سے بھاگنا اور اس عورت کا حضرت یوسف علیہ السلام کا پیچھا کرنا۔

نمبر ۳ اس عورت کے خاندان کے ایک شخص کا اس عورت کو قصوروار قرار دینا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کو بیان کرنا۔

نمبر ۴ اس دعوت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر ان عورتوں کا ہاتھ کاٹ لینا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کے لیے سبحان اللہ کہنا اور ان کی پارسائی کی وجہ سے ان کو فرشتہ قرار دینا۔

نمبر 3 **قید کی مدت:** عکرمہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سات سال قید خانے میں رہے۔[1] طارق اور سعید ابن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے یہ مدت چھ ماہ تھی۔[2]

ابو صالح رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ مدت پانچ سال تھی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے ایک اور روایت یہ ہے کہ یہ مدت ایک سال کی تھی عکرمہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے سات سال کی روایت کی ہے عطار حمہ اللہ نے کہا یہ قید اس وقت تک کے لیے تھی حتی کہ لوگوں کی زبانیں اس واقعہ کے ذکر سے بند ہو جائیں الماوردی رحمہ اللہ نے کہا اس قید کی کوئی مدت معین نہیں کی گئی تھی اور ان کو غیر محدود مدت کے لیے قید کیا گیا تھا اور یہی قول صحیح ہے۔[3]

خلاصہ بحث

قرآن مجید میں رجوع الی اللہ (اللہ کی طرف رجوع) ایک بنیادی اصول کے طور پر بار بار بیان ہوا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی اس کی بہترین عملی مثال ہے کہ انسان کس طرح شدید آزمائش، نفسانی خواہشات اور سماجی دباؤ کے باوجود اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جب عزیز مصر کی بیوی اور دیگر عورتوں نے اپنی سازشوں کے ذریعے یوسف علیہ السلام کو گناہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے اپنے رب سے دعا کی: "اے میرے رب! مجھے قید ہونا اس گناہ سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں۔ اور اگر تو نے ان کے مکر کو مجھ سے دور نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔" (یوسف: 33)۔ اس دعا میں یوسف علیہ السلام نے نہ صرف اپنی کمزوری کا اعتراف کیا بلکہ اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ گناہ سے بچنا اللہ کی مدد اور توفیق کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے وضاحت کی کہ یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا قید کی خواہش نہیں بلکہ گناہ کے مقابلے میں ایک چھوٹی مصیبت کو برداشت کرنے کا اظہار ہے۔ انہوں نے یہ نکتہ بھی بیان کیا کہ اگر یوسف علیہ السلام اللہ سے محض عافیت مانگتے تو اللہ تعالیٰ ان کو بلا جیل گئے مکمل حفاظت عطا کرتا، مگر ان کی دعا میں عاجزی اور شدتِ خوف کا پہلو غالب تھا۔ اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ انسان کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے "عافیت" مانگنی چاہیے اور گناہ کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی مدد کا طالب ہونا چاہیے۔ معارف القرآن

[1] جامع البیان رقم الحدیث ۱۴۷۴

[2] تفسیر ابن ابی حاتم رقم الحدیث ۱۵۹۱

[3] زاد المسیر جلد چار صفحہ ۲۲۲ مطبوعہ مکتبہ اسلامی بیروت ۱۴۱۷ تبیان القرآن جلد ۵، ص ۴۸۷

نے یہ بھی بتایا کہ ہر گناہ کا سبب جہالت ہے، اور اصل علم انسان کو معصیت سے دور کرتا ہے۔ اس سے رجوع الی اللہ کی یہ صورت سامنے آتی ہے کہ بندہ ہر وقت اللہ کی پناہ میں رہنے کو اپنی اصل طاقت سمجھے۔

ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ نے رجوع الی اللہ کو "ایمان کی عملی کیفیت" قرار دیا۔ انہوں نے وضاحت کی کہ یوسف علیہ السلام نے جب یہ دعا کی تو یہ دراصل اپنی عاجزی اور بندگی کا عملی اظہار تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اپنی قوت پر بھروسہ کرنا توکل کے منافی ہے، اس لیے اللہ کے حضور استغاثہ پیش کیا۔ ضیاء القرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں عورتوں کی سازش سے بچایا۔ مزید یہ کہ جب یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی کے دلائل کھل کر ظاہر ہو گئے تو انہیں جیل میں ڈال دیا گیا تاکہ معاشرے میں فتنہ دب جائے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ رجوع الی اللہ کا مطلب یہ نہیں کہ آزمائشیں ختم ہو جاتی ہیں بلکہ اصل رجوع یہ ہے کہ انسان آزمائش کے باوجود اللہ پر اعتماد قائم رکھے اور اس کے فیصلے کو قبول کرے۔ یہی یقین مومن کو اخلاقی پختگی اور روحانی بلندی عطا کرتا ہے۔

تبیان القرآن میں علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ نے رجوع الی اللہ کے اس پہلو کو مزید تفصیل سے بیان کیا کہ یوسف علیہ السلام کے سامنے کئی ظاہری ترغیبات اور دھمکیاں موجود تھیں: عورتوں کی خوبصورتی، مال و مرتبے کی پیشکش، اور انکار پر قتل یا قید کی دھمکی۔ اس ماحول میں انسانی طاقت اور بشری قوت اتنی شدید آزمائش کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے یوسف علیہ السلام نے اللہ کی طرف رجوع کر کے اپنی کمزوری کا اقرار کیا اور فرمایا کہ "اگر تو نے مدد نہ فرمائی تو میں ڈگمگا جاؤں گا۔" علامہ سعیدی کے نزدیک یہ رجوع الی اللہ صرف وقتی دعا نہ تھی بلکہ عملی ترجیح بھی تھی۔ انہوں نے دنیا کی عارضی لذت کے مقابلے میں قید کی مشقت کو پسند کیا تاکہ آخرت کی رسوائی سے بچے رہیں۔ اس سے تین قاعدے نکلتے ہیں: (۱) دو مصیبتوں میں انسان کو چھوٹی مصیبت اختیار کرنی چاہیے؛ (۲) آخرت کی سزا کے مقابلے میں دنیا کی تکلیف کو ترجیح دینا چاہیے؛ (۳) گناہ سے بچنا صرف اللہ کی مدد سے ممکن ہے۔ یہ دراصل رجوع الی اللہ کی اعلیٰ ترین شکل ہے کہ بندہ اپنی عقل، طاقت اور خواہش پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ کی پناہ لیتا ہے۔

ان تینوں تفاسیر کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ رجوع الی اللہ محض زبانی دعا نہیں بلکہ یہ ایک ہمہ گیر رویہ ہے جو انسان کو ہر حال میں اللہ کی طرف جھکا دیتا ہے۔ معارف القرآن نے اس پہلو کو اجاگر کیا کہ گناہ سے بچنا اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، تبیان القرآن نے عملی پہلو نمایاں کیا کہ دنیاوی مشقت کو آخرت کی سزا پر ترجیح دینا ہی اصل رجوع ہے، جبکہ ضیاء القرآن نے یہ بتایا کہ رجوع الی اللہ ایمان اور توکل کی عملی صورت ہے جو آزمائش کے باوجود قائم رہتی ہے۔ یوں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ واقعہ ہر دور کے مؤمن کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ مشکلات اور خواہشات کے طوفان میں اصل پناہ صرف اللہ کی ذات ہے اور رجوع الی اللہ ہی نجات کا ذریعہ ہے۔

فصل دوم تعبیر رؤیا اور معاشرتی مسائل

تعبیر کی لغوی تعریف

تعبیر کی لغوی معنی عبور کے ہیں یعنی پانی چیر کر دوسرے کنارہ پر پہنچ جانا۔[1]

تعبیر اصطلاح میں صورت خیالیہ سے معانی نفسانیہ تک پہنچے نے کا نام ہے۔[2]

علم تعبیر وہ علم ہے جس میں خوابوں کی تعبیر کے اصول و قواعد بیان کیے جاتے ہیں۔[3]

علم تعبیر کا موجد

گو ہر چیز کا موجد در حقیقت حق تعالی ہے لیکن حرف عام میں ہر علم کا موجد اس شخص کو کہتے ہیں جس نے سب سے پہلے اس علم کو دنیا میں رواج دیا ہو جیسے علم منطق کا موجد اور اسو اور علم عروض کا موجد خلیل نحوی ہے پس علم تعبیر کے موجد اور واضع حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جن کو سب سے پہلے یہ علم اللہ تعالی کی طرف سے عطا ہوا انہوں نے اس کو دنیا میں مروج کیا چنانچہ ارشاد باری **وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ**[4]

ترجمہ یہ یوسف اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ بنالے گا اور تجھے علم تعبیر خواب عطا فرمائے گا اس آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام سے علمی تعبیر خواب عطا فرمایا نیک وعدہ کیا گیا پھر یہ وعدہ پورا بھی کر دیا گیا یعنی حضرت یوسف علیہ السلام اس بات کا خود اعتراف کرتے ہیں کہ **ربي قد اتيتني من الملک وعلمتني من تاويل الْاَحَادِيْثِ**[5]

اے پروردگار تو نے مجھے سلطنت بھی عطا فرمائی اور علم تعبیر خواب بھی عطا فرمایا

وجہ شہرت یوسف علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام جب جیل میں چلے گئے واقعہ زلیخا کے سلسلے میں تو مصر کی جیل خانے میں اس کے ساتھ دو نوجوان بھی اس کے ساتھ ہمراہ جیل خانے میں گئے تھے اور دونوں کو جیل میں خواب آیا تھا اور ان کا تعبیر یوسفؑ نے بتایا اس قصہ کو قرآن سورۃ یوسف کی آیت نمبر 36 سے 41 تک ذکر کرتا ہے ان دونوں میں سے ایک کو رہائی مل گئی بادشاہ کا ساقی شراب بنایا گیا اور دوسرے کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا اس واقعے کے بعد بادشاہ نے خواب دیکھا اور وہی بندہ جس کو رہائی مل گئی تھی اور بادشاہ کا ساقی تھا سب سے پہلے لوگوں کو جمع کیا لیکن کسی نے تعبیر نہ دی بلکہ یہ کہا کہ اضغاث احلام اس ساتھی نے کہا کہ مجھے اس بارے میں پتہ ہے وہ اس خواب کا اچھا تعبیر دے گا پھر بادشاہ نے جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پیچھے بندے بھیجے اور اس خواب کی تعبیر بتلادی اور تدبیر بھی یہ واقعہ وجہ شہرت بن گئی حضرت یوسف علیہ السلام کے علم تعبیر کے بارے میں۔

علم تعبیر کے لئے کون کون سے علوم ضروری ہے

علم تعبیر میں ماہر و کامل ہونے کے لیے مندرجہ ذیل علوم کا جاننا نہایت ضروری ہے:

---

[1] ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، بیروت: دار صادر، جلد 4، مادہ عبر

[2] الجمال والکمال ص ۱۸۰

[3] محمد بن سیرین، تعبیر رویا، زاویہ پبلشر، لاہور، ۲۰۰۱، ص ۵۱ سے ۵۲

[4] سورہ یوسف: ۴

[5] سورہ یوسف: ۱۰۱

ٹوٹل آٹھ قسم کے علوم ہیں ان پر عبور حاصل ہو تب آدمی تعبیر دے ورنہ نہیں نمبر ایک علم تفسیر نمبر دو علم حدیث نمبر تین علم ضرب الامثال نمبر چار اشعار عرب نمبر پانچ نوادر نمبر چھ علم اشتقاق یعنی علم صرف کا ایک حصہ نمبر سات علم لغت نمبر اٹھ علم الفاظ متداولہ [1]

علم تعبیر کی فضیلت

تعبیر ایک نہایت افضل علم ہے اس کی فضیلت مندرزیل ہے دلائل قرآنی سے ثابت ہے اس چیز کو اللہ تعالی اپنے خاص انعامات میں شمار کرے اس کے افضل ہونے میں کوئی کلام نہیں چنانچہ علم تعبیر کو خدا تعالی نے انعامات یوسفی میں شمار کیا ارشاد باری تعالی ہے **وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ** [2]

اس آیت سے علم تعمیر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے وہ اس طرح کہ اگر یہ علم اچھا اور افضل نہ ہوتا تو حق تعالی اس کو اپنے انعامات میں کیوں ذکر کرتا انعامات الہی میں اس کا مذکور ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ علم تعبیر خواب ایک نہایت افضل اور اعلی علم ہے جناب سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج شریف کے بعد ایک خواب دیکھا جس کی خدا تعالی خود تصدیق فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد خداوندی ہے **لَّقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ** ترجمہ حق تعالی نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب سچا کر دکھایا اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تصدیق فرمائی ہے اس سے ثابت ہوا کہ خواب ایک نہایت پر اسرار چیز ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خواب دکھایا گیا اور اللہ تعالی نے آپ کے اس خواب کی تصدیق فرمائی ظاہر بات ہے کہ جو چیز پیغمبروں کو بطور انعام نصیب ہوا اور اس کو حق تعالی صحیح اور درست بھی فرمارہے ہیں اس کے افضل ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے جب ثابت ہوا کہ خواب ایک پر اسرار نعمت ہے تو ساتھ اس سے یہ بات بھی لازمی طور پر ثابت ہو گئی کہ خواب کی تعبیر کا علم بھی ایک نہایت اعلی اور افضل چیز ہے کیونکہ یہ بات اظہر من شمس ہے کہ علم کی شرافت اس کے موضوع کی شرافت سے ہوتی ہے آیات مذکورہ بالا سے خواب کا افضل ہونا ثابت ہوں چکا ہے پس ثابت ہوا کہ جس علم میں خواب کے حالات مذکور ہیں وہ علم علم تعبیر بھی افضل واعلی ہوتا ہے اسی طرح علم تعبیر کی فضیلت احادیث نبویہ صحابہ کرام اور بزرگان دین کے اقوال سے بھی ثابت ہے۔ [3]

معبر کے آداب وشرائط

یعنی تعبیر بتانے والے میں مندرجہ ذیل آداب وشرائط کا پایا جانا ضروری ہے اس کے بارے میں مختلف علماء کے مختلف اقوال ہے حضرت امام ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ معبّر کو عالم دین ہونے کے علاوہ ان باتوں کا بھی پابند ہونا ضروری ہے کہ لوگوں کے طور اتوار اور فضائل وخصائل کا خوب پہچان اور اللہ تعالی سے یہی توفیق مانگتا رہے کہ اللہ تعالی اس کی زبان پر اچھی اور ثواب کی بات ہی جاری کرے اور گناہوں سے بچتا رہے اور لقمہ حرام کھانے اور بے ہودہ باتیں کہنے اور سننے سے دور رہے تاکہ وہ **اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ** کا مصداق بن جائے۔

---

[1] محمد بن سیرین، تعبیر رویا، زاویہ پبلشر، لاہور، ۲۰۰۱، ص ۵۱ سے ۵۲

[2] سورہ یوسف آیت: ۲۱

[3] ایضا تعبیر رویا ص ۵۴

حضرت ابراہیم کرمانی رح فرماتے ہیں

معبّر کو ان آداب کے ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ وہ خواب کو نہایت ہوشیاری اور خاص توجہ سے سنیں اور خواب پوچھنے والے کے دین مذہب اور خیالات سے واقفیت حاصل کر لے تاکہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ سائل سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ کیونکہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حدیث **أصدقكم رؤيا أصدقكم حديثا**[1] یعنی جو تم میں سے زیادہ سچا ہوتا ہے وہی شخص خواب بیان کرنے میں بھی تم سب سے زیادہ راست گو اور سچا ہوتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ

حضرت امام جعفر صادق رحم اللہ فرماتے ہیں کہ چار قسم کے لوگوں سے تعبیر خواب پوچھنا ناجائز ہے نمبر ایک ان لوگوں سے جو شریعت کے پابند نہ ہو نمبر دو عورتوں سے نمبر تین جاہلوں سے اور نمبر چار دشمن سے ان سب کو بیان کرنا اور پوچھنا ناجائز ہونے کے وجوہات کتاب میں مذکور ہے۔[2]

رؤیا کی لغوی تعریف

والرُّؤْيا، بالضم مَهْموزاً، وقد يُخَفَّف. ما رأيتَ في مَنامِك.

رُؤْیا (ضم کے ساتھ، یعنی "رُؤْیا")، ہمزہ کے ساتھ ہوتا ہے، اور کبھی اسے "تخفیف" (ہلکا) بھی کیا جاتا ہے۔

یعنی: "وہ چیز جو تُو نے اپنے خواب میں دیکھی ہو۔"

وفيها لُغَات، يأتي بيانُها في المُشْتَرَكات.

اور اس لفظ میں مختلف لغات (زبانیں / لہجے) ہیں، جن کی وضاحت "مشترکات" کے باب میں آئے گی۔

وقال اللِّحْياني: رأيتُ رُؤْيا حَسَنةً، ولا تُجْمَع.

لحیانی (لغوی عالم) کہتے ہیں" : میں نے ایک اچھا خواب دیکھا۔ اور "رؤیا" کا جمع (جمع صیغہ) نہیں آتا (یعنی یہ لفظ مفرد ہی استعمال ہوتا ہے)۔

وقال الجوهري: رأى في مَنامِه رؤْيا، على فُعْلى لا تُثَنّى.

جوہری (معروف لغوی) کہتے ہیں :"اس نے اپنے خواب میں رؤیا دیکھی۔"

اور یہ "فُعْلى" کے وزن پر ہے، جو نہ تثنیہ رکھتا ہے اور نہ جمع (یعنی "دو خواب" یا "خوابوں" کے لیے دوسرے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، "رؤیا" کو تثنیہ یا جمع نہیں بنایا جاتا)۔[3]

رؤیا کی اصطلاحی تعریف

"الحَـمَيَةُ الدّالَّةُ عَلى ما يَقَعُ في النَوم"

ترجمہ: "وہ علامات یا حالت جو نیند (یعنی خواب) میں کسی واقعے کے پیش آنے کی نشاندہی کرے۔"

---

[1] سنن ابو داؤد، ح ۵۰۱۹

[2] تعبیر رویا ص ۵۵

[3] مرتضى الزبيدي، تاج العروس، من جواهر القاموس، الإمام محب الدين أبي فيض السيد محمد مرتضى الحسيني الواسطي الزبيدي الحنفي، المجلد التاسة عشر، باب الهاء، باب الواو والياء، علي الشيري، دار الفكر بيروت

یوسفؑ کا خواب منتخب تفاسیر کی روشنی میں

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ۔ قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَیَكِیْدُوْا لَكَ كَیْدًا-اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ وَ كَذٰلِكَ یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَ یُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اٰلِ یَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَیْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ-اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ۔ [1]

ترجمہ : جس وقت کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ میں نے دیکھا خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا میں نے ان کو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے کہا اے بیٹے مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے اگے پھر وہ بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب البتہ شیطان ہے انسان کا صریح دشمن اور اسی طرح برگزیدہ کرے گا تجھ کو تیرا رب اور سکھلائے گا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا اور پورا کرے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھر پر جیسا پورا کیا ہے تیرے دو باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام پر البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا ہے ۔

تفسیر معارف القرآن [2]

خلاصہ تفسیر : آغاز قصہ وہ وقت قابل ذکر ہے جب یوسف علیہ السلام نے اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے کہا کہ ابا میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند دیکھے ہیں ان کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بیٹا اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا کیونکہ وہ خاندان نبوت میں سے ہونے کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر کو جانتے ہیں کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی اور سورج والد اور چاند ماں ہے اور سجدہ کرنے سے مراد ان سب کا تمہارے لیے مطیع و فرمانبردار ہونا ہے تو وہ تمہارے ایذا رسانی کے لیے کوئی خاص تدبیر کریں گے یعنی بھائیوں میں سے اکثر کیونکہ دس بھائی علاتی تھے ان سے خطرہ تھا صرف ایک بھائی حقیقی بنیامین تھے جن سے کسی خلاف کا تو اندیشہ نہ تھا مگر یہ احتمال تھا کہ ان کے منہ سے بات نکل جائے بلاشبہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے اس لیے بھائیوں کے دل میں وسوسے ڈالے گا اور جس طرح اللہ تعالی تم کو یہ عزت دے گا کہ سب تمہارے تابع اور مطیع ہوں گے اس طرح تمہارے رب تم کو دوسری عزت نبوت کے لیے بھی منتخب کرے گا اور تم کو خوابوں کی تعبیر کا علم دے گا اور دوسری نعمتیں دے کر بھی تم پر اور اولاد یعقوب پر اپنا انعام کامل کرے گا جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے دادا ابراہیم اور اسحاق علیہ السلام پر اپنا انعام کامل کر چکا ہے واقعی تمہارا رب بڑا علم والا اور بڑی حکمت والا ہے۔ [3]

قولہ تعالی :اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ

تشریح: یعنی یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ اباجان میں نے خواب میں 11 ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں یہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب تھا جس کی تعبیر کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہما فرماتے ہیں کہ 11 ستاروں سے مراد یوسف علیہ السلام کے 11 بھائی اور سورج و چاند سے مراد ماں باپ تھے قرطبی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ اگرچہ سارا

[1] یوسف ۱۲:۶، ۴

[2] معارف، ج ۵ ص ۱۴ سورہ یوسف آیت نمبر ۴ تا ۵

[3] معارف القرآن، ج ۵، ص ۱۵

واقعہ سے پہلے وفات پاچکی تھی مگر ان کی خالہ والدماجد کی نکاح میں آگئی تھی خالہ خود بھی ماں کے قائم مقام سمجھی جاتی ہے خصوصاجب کہ وہ والد کی زوجیت میں آجائے تو عرفاً اس کو ماں ہی کہا جائے گا۔[1]

قولہ تعالی: قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاکَ عَلٰٓی اِخْوَتِکَ فَیَکِیْدُوْا لَکَ کَیْدًا ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

یعنی بیٹا تم اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ کہنا ایسا نہ ہو کہ وہ یہ خواب سن کر تمہاری عظمت شان معلوم کر کے تمہیں ہلاک کرنے کی کوئی تدبیر کریں کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے وہ دنیا کے جاہ ومال کی خاطر انسان کو ایسے کاموں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

خواب کی حقیقت اور درجہ اور اس کی قسمیں

مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیات کے ذیل میں چند مسائل ذکر کئے ہیں جو قابل ذکر ہیں: سب سے پہلے خواب کی حقیقت اور اس سے معلوم ہونے والے واقعات واخبار کا درجہ اور مقام ہے تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناءاللہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حقیقت خواب کی یہ ہے کہ نفس انسان جس وقت نیند یا بے ہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہو جاتا ہے تو اس کو اس کی قوت خیالیہ کی راہ سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں اسی کا نام خواب ہے پھر اس کی تین قسمیں ہیں جن میں سے دو باطل ہیں ان کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں ہوتی اور ایک اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح وصادق ہے مگر اس صحیح قسم میں بھی کچھ عوارض شامل ہو کر اس کو فاسد وناقابل اعتبار کر دیتے ہیں۔

تفصیل: اس کی یہ ہے کہ خواب میں جو انسان مختلف صورتیں اور واقعات دیکھتا ہے کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بیداری کی حالت میں جو صورتیں انسان دیکھتا رہتا ہے وہی خواب میں متشکل ہو کر نظر آتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کوئی صورتیں اور واقعات اس کے ذہن میں ڈالتا ہے کبھی خوش کرنے والے اور کبھی ڈرانے والے یہ دونوں قسمیں باطل ہیں جن کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ اصلیت نہ اس کی کوئی واقعی تعبیر ہو سکتی ہے ان میں پہلی قسم کو حدیث النفس اور دوسری کو تسویل شیطانی کہا جاتا ہے

تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک قسم کا الہام ہے جو آپ نے بندے کو متنبہ کرنے یا خوشخبری دینے کے لیے کیا جاتا ہے اللہ تعالی اپنے خزانہ غیب سے بعض چیزیں اس کے قلب ودماغ میں ڈال دیتے ہیں

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کا خواب ایک کلام ہے جس میں وہ اپنے رب سے شرف گفتگو حاصل کرتا ہے یہ حدیث طبرانی نے بسند صحیح روایت کی ہے۔[2]

صوفیاء کرام کے نزدیک خواب کی تحقیق

اس کی تحقیق صوفیاء کرام کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ عالم میں جتنی چیزیں وجود میں آنے والی ہیں اس وجود سے پہلے ہر چیز کی ایک خاص شکل عالم مثال میں ہوتی ہے اس عالم مثال میں جس طرح جواہر اور حقائق ثابتہ کی صورتیں اور شکلیں ہوتی ہیں اسی طرح معانی اور اعراض کی بھی خاص شکلیں ہوتی ہیں خواب میں جب نفس انسانی ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہوتا ہے تو بعض اوقات اس کا تعلق عالم مثال سے ہو جاتا

---

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۱۸

[2] قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف، ج۵، ص۱۷۴

ہے وہاں جو کائنات کی شکلیں ہیں وہ اس کو نظر آجاتی ہیں پھر یہ صورت عالم غیب سے دکھائی جاتی ہیں بعض اوقات ان میں بھی کچھ عوارض ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اصل حقیقت کے ساتھ کچھ تخیلات باطلہ شامل ہو جاتے ہیں اس لیے اہل تعبیر کو بھی اس کی تعبیر سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ تمام عوارض سے پاک صاف رہتی ہیں تو وہ اصل حقیقت ہوتی ہیں مگر ان میں بھی بعض خواب محتاج تعبیر ہوتے ہیں کیونکہ ان میں حقیقت واقعہ واضح نہیں ہوتی ایسی صورت میں بھی اگر تعبیر غلط ہو جائے تو واقعہ عام مختلف ہو جاتا ہے اس لیے صرف وہ خواب صحیح طور پر الہام من اللہ اور حقیقت ثابتہ ہو گی جو اللہ کی طرف سے ہو اور اس میں کچھ عوارض بھی شامل نہ ہوئے ہوں اور تعبیر بھی صحیح دی گئی ہو انبیاء علیہم السلام کے سب خواب ایسے ہی ہوتے ہیں اس لیے ان کے خواب بھی وحی کا درجہ رکھتے ہیں عام مسلمانوں کے خواب میں ہر طرح کے احتمال رہتے ہیں اس لیے وہ کسی کے لیے حجت اور دلیل نہیں ہوتے ان کے خوابوں میں بعض اوقات طبعی اور نفسانی صورتوں کی امیزش ہو جاتی ہے اور بعض اوقات گناہوں کی ظلمت و کدورت صحیح خواب پر چھا کر اس کو ناقابل اعتماد بنا دیتی ہے اور بعض اوقات تعبیر صحیح سمجھ میں نہیں آتی خواب کی یہ تین قسمیں جو ذکر کی گئی ہیں پہلی تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خواب کی تین قسمیں ہیں ایک قسم شیطانی ہے جس میں شیطان کی طرف سے کوئی صورتیں ذہن میں آتی ہیں دوسری وہ جو آدمی اپنی بیداری میں دیکھتا رہتا ہے وہی صورتیں خواب میں سامنے آجاتی ہیں تیسری قسم جو صحیح اور حق ہے وہ نبوت کے اجزاء میں سے 46 جز ہے یعنی اللہ تعالی کی طرف سے الہام ہے

خواب میں جز نبوت ہونے کے معنی اور اس کی تشریح

یہ قسم یعنی جو حق اور صحیح ہے اس میں روآیات حدیث مختلف ہیں 40 سے لے کر 70 واں جز ہونا تک منقول ہے۔[1] یہ سب روایات تفسیر قرطبی میں جمع کر کے ابن عبدالبر کی تحقیق نے یہ نقل کی ہے کہ ان میں کوئی تضاد و مخالفت نہیں ہے بلکہ ہر ایک روایت اپنی جگہ صحیح اور درست ہے یہاں یہ بات حل طلب ہے کہ سچے خواب کے جز نبوت ہونے سے کیا مراد ہے تفسیر مظہری میں اس کی توجیہ بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نبوت کا سلسلہ 23 سال جاری رہا ان میں سے پہلے ششماہی میں یہ وحی الہی خوابوں کی صورت میں آتی ہے باقی 45 ششماہیوں میں جبرائیل امین کے پیغام رسانی کی صورت میں ائی اس حساب سے سچے خوابیں وہی نبوت کا 46 واں جز ہوا اور جن روآیات نے کم و پیش عدد مذکور ہیں ان میں یا تقریبی کلام کیا گیا ہے یا سند کے اعتبار سے ساقط ہیں اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کے جز نبوت ہونے سے مراد یہ ہے کہ خواب میں بعض اوقات انسان ایسی چیزیں دیکھتا ہے جو اس کی قدرت میں نہیں مثلا یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر اڑ رہا ہے یا غیب کی ایسی چیزیں دیکھیں جن کا علم حاصل کرنا انکی قدرت میں نہ تھا تو اس کا ذریعہ بجز امداد و الہام خداوندی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جو اصل میں خاصہ نبوت ہے اس لیے اس کو ایک جز نبوت قرار دیا گیا۔[2]

خواب ہر شخص سے بیان کرنا درست نہیں

اس کے متعلق مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے دو احادیث نقل کی ہیں بحوالہ ترمذی اور ابن ماجہ کے ان کا تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کا ہوتا ہے ایک اللہ کی طرف سے بشارت دوسرا نفسانی خیالات تیسرے شیطانی تصورات اس لیے

---

[1] الجامع لاحکام القرآن، ج۵، ص۸۳

[2] معارف القران، ج۵، ص۲۰

جو شخص کوئی خواب دیکھے اور اسے بھلا معلوم ہو تو اس کو اگر چاہے لوگوں سے بیان کر دے اور اگر اس میں کوئی بری بات نظر آئے تو کسی سے نہ کہے بلکہ اٹھ کر نماز پڑھے۔[1]

تفسیر ضیاالقرآن[2]

قولہ تعالی: اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ[3]

تشریح: یوسف علیہ السلام کے خواب کے متعلق تین آیات ہیں ان تینوں آیات کی تشریح اور تحقیق کچھ اس طرح ہے کہ آیت نمبر چار میں حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ خواب دیکھا تو اس کی عمر کتنی تھی تو اس وقت اس کی عمر کے متعلق پیر کرم شاہ الازہری صاحب نے اپنی تفسیر میں یہ ذکر کیا ہے کہ چھوٹی عمر میں یہ خواب دیکھا تھا پھر یہ ذکر کیا ہے کہ کتنے سالوں کے تھے تو بعض روایات کے مطابق تیرہ سال اور بعض روآیات کے مطابق اس سے بھی کم پھر اپنے والد سے بیان کیا۔

اس آیت میں **رأیت** دو دفعہ مذکور ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ پیر کرم شاہ الازہری صاحب نے لفظ رایت دو دفعہ ذکر کرنے کی وجہ بیان کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے آپ نے گیارہ چمکتے ہوئے ستارے اور شمس اور قمر دیکھا پھر دیکھا کہ وہ سجدہ کر رہے ہیں یہ دونوں مشاہدے کیونکہ مستقل اہمیت کے حامل تھے اس لیے ان کو الگ الگ ذکر فرمایا۔ رایتھم کی ضمیر کا مرجع ستارے اور شمس و قمر ہیں قاعدے کے مطابق رایتھا ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ غیر ذوی العقول ہیں لیکن ان سے اطاعت وانقیاد کا جو فعل صادر ہو رہا ہے وہ ذوی العقول کا فعل ہے اس لیے ان کے لیے مذکر کی جمع استعمال کی آیت میں سجدے سے کیا مراد ہے اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں مراد ہو سکتے ہیں یعنی لغوی معنی بھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے آپ کے سامنے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دی۔[4]

قولہ تعالی: قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤی اِخْوَتِكَ فَیَكِیْدُوْا لَكَ كَیْدًا ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے فرزندوں سے زیادہ حضرت یوسفؑ سے محبت کیا کرتے تھے اس آیت کی تفسیر میں پیر کرم شاہ صاحب نے تورات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یعنی یوسف علیہ السلام سے محبت ہونے کے متعلق کہ اسرائیل یوسف کو اپنے تمام بیٹوں سے زیادہ پیار کرتے تھے کیوں کہ وہ اس کے بڑھاپے کا بیٹا تھا اور اس نے اسے ایک بو قلموں قبا بھی بنائی تھی (پیدائش 3:37)

اس پر پیر کرم شاہ صاحب رد کرتے ہوئے لکھا ہے میرے نزدیک محبت کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے بعد کی کہاوت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کی سلیم الطبعی، شرافت اور مدارج عالیہ پر فائز کرنے والی صلاحیتوں کے آثار و انوار آپ کے چہرے پر نمایاں تھے اسی لیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو دل سے چاہتے تھے۔

---

[1] ایضا معارف القران، ج ۵، ص ۲۰

[2] پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۰، ج ۲، ص ۴۲۸

[3] سورہ یوسف: ۴ تا ۶

[4] تفسیر ضیاء القرآن ص، ج ۲، ص ۴۱۰

بُنَيَّ ابن کی تصغیر ہے جو انتہائی محبت کی غمازی کر رہی ہے جب یوسف علیہ السلام نے یہ خواب اپنے والد سے بیان کیا تو آپ نے اس کی تعبیر بتانے سے پہلے یوسف کو ہدایت کی کہ یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا مبادہ وہ درپہ آزار ہوں کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ بھائی ان سے حسد کرتے ہیں اس آیت کے آخر میں شیطان کے بارے میں ذکر ہے یعنی یہ سارا کام شیطان کرائے گا شیطان کا کام بہکانا اور دھوکہ دینا جیسا کہ آدم اور حوا کو دھوکا دیا جنت میں اسی طرح قابیل اور ہابیل کا جو واقعہ ہے اس لیے شیطان کی مکاریوں سے کوئی بعید نہیں کہ وہ تیرے بھائیوں کو تیرے خلاف اکسائے اور تجھے تکلیف پہنچانے کے لیے ان کو برانگیختہ کردے اس لیئے تم اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں نہ کرنا۔

قولہ تعالی: وَ كَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ[1]

اس آیت کریمہ میں پیر کرم شاہ الازہری صاحب لفظ **اجتبی** کی تحقیق کی ہے مختلف ائمہ لغت کی رو سے وہ مندرجہ ذیل ہے:

اجتبی کی تحقیق

جاحزؒ لکھتے ہیں کہ جَبُيتَ الشّيِيَ سے مشتق ہے اس کا معنی ہے کسی چیز کو اپنے لیے مخصوص کر لینا۔

قَالَ الزَّجَاجِ الِاجْتِبَاء مُشْتَقٌّ مِنْ جُبِيت الشّيِيَ إذَا أَخْلَصتَهُ لِنَفْسک

عَلامہ رَاغِب أَصِفهأَنی اجْتَبااللہ الْعَبْدُ تَخْصّيصه اِيَاهُ بِفَيْضِ الْإِلَهِيّ يَتَحصَّلُ لَهُ مِنْهُ أَنْوَاعٌ مِنَ النِّعَمِ بِکَ سَعَى مِنْ الْعَبْدِ وَ ذَلِکَ لِلْأَنْبِيَاءِ وَ بَعْضَ مَنْ يُقَارِبُهُمْ مِنْ الصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَاءِ[2]

یعنی اللہ تعالی کسی بندے کو چن لینے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی اس بندے کو اپنے مخصوص فیض سے بہریاب فرماتا ہے جب جس کی برکت سے اسے طرح طرح کی نعمتیں بغیر اس کی ذاتی کوشش کے حاصل ہوتی ہیں اور یہ شرف انبیاء کو اور صدیقین اور شہداء کو بخشا جاتا ہے۔

اس بعد پیر کرم شاہ الازہری صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے فرزند ارجمند کو مزید خوشخبری سنا رہے ہیں کہ اللہ تعالی آپ کو خوابوں کی تعبیر کا ملکہ عطا فرمائے گا امام رازی نے تاویل الحدیث کا ایک اور مفہوم بھی بیان فرمایا ہے یعنی روحانی اور جسمانی مخلوقات سے اللہ تعالی کی قدرت حکمت اور اس کی جلالت شان پر استدلال کرنا

الْمُرَادُ مِنْ التَّأْوِيلِ الْأَحَادِيث كَيْفِيَّةِ الِاستِدْلَالِ بَأُصَناف الْمَخْلُوقَاتِ الرُّوحَانِيَّةِ وَ الْجُسمَانِيَّةِ عَلَى قَدْرِةِ اللہ تعالی وَ حِكْمَتُه وَ جَلَالَتُه[3]

نعمتہ سے مراد دنیاوی بھی اور اخروی سعادتیں ہیں اور نعمت نبوت تمام نعمتوں سے افضل و برتر ہے۔

---

[1] سورہ یوسف:6

[2] راغب اصفہانی، مفردات القرآن، المکتبۃ القاسمیہ، لاہور، ۱۹۶۳

[3] إمام محمد الرازي فخر الدين بن ضياء الدين، تفسیر کبیر، دار الفکر، ۱۹۸۱، ج۶، ص ۴۷

علیم حکیم یعنی وہ خوب جانتا ہے کہ کون سی نعمت کس کس کو دی جائے اور اس کا فعل حکمت سے خالی نہیں ان الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس کے ساتھ جو کیا وہ سب اللہ کو معلوم تھا اور ظاہری طور پر بھائیوں نے ان کو وہ نقصان پہنچایا لیکن وہ اس کے لیے اعلی مقام کا ذریعہ بنا یہ حکمت خداوندی ہے۔

تفسیر تبیان القرآن[1]

خواب اور تعبیر رؤیا کے متعلق اقوال: علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے خواب اور تعبیر رؤیا کے متعلق اپنے تفسیر میں مندرجہ ذیل باتیں ذکر کی ہے:

اقوال نمبر1: نیند کی تعریف نمبر2: خواب کی تعریف نمبر3: خواب کی اقسام نمبر4: اچھے اور برے خوابوں کا شرعی حکم نمبر5: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب اور بیداری میں زیارت کے متعلق نمبر6: چند خوابوں کی تعبیروں کے متعلق احادیث

نمبر7: خواب کی تعبیر بتانے کی اہلیت نمبر8: بھائیوں کو خواب سنانے سے منع کرنے کا سبب نمبر9: خواب کی غلط تعبیر بیان نہ کرنا

نمبر10: سچے خوابوں کی بشارت ہونے کی تفصیل۔

قولہ تعالی: اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ۔

آیت کی تشریح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب میں ستاروں سورج اور چاند کو دیکھنا زمخشری رحمہ اللہ نے کہا لفظ یوسف عبرانی زبان کا لفظ ہے کیونکہ اگر یہ عربی زبان کا لفظ ہوتا تو یہ منصرف ہوتا کیونکہ یہ صرف علم ہے اور اس میں تنوین سے مانع کی کوئی چیز نہیں ہے تو اس پر تنوین نہ آنا اور اس کا غیر منصرف ہونا اس کے عبرانی ہونے کی دلیل ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ 11 ستاروں اور سورج اور چاند نے ان کو سجدہ کیا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی 11 بھائی تھے اس لیے 11 ستاروں کی 11 بھائیوں کے ساتھ تعبیر کی گئی اور سورج اور چاند کی ماں باپ کے ساتھ تعبیر کی گئی اور سجدہ سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے تواضع سے جھک جائیں گے اور ان کے احکام کی پیروی کریں گے۔[2]

حضرت یوسف علیہ السلام کا 11 ستاریں دیکھنے کا مطلب:

اس دیکھنے سے مراد خواب میں دیکھنا ہے ان کی دو وجوہات ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ حقیقت میں ستارے سجدہ نہیں کرتے اس وجہ سے اس کلام کو خواب پر محمول کرنا واجب ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے فرمایا اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے نہ بیان کرنا۔

ان ستاروں کے اسماء

[1] ایضا تبیان القرآن، ج۵، ص۵۴۴ تا ۶۰۴

[2] تبیان القرآن، ج۵، ص۶۶۳

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ بتانہ نام کا ایک یہودی نبی علیہ السلام کے پاس ایا اور کہا اے محمد مجھے ان تاروں کے نام بتائیں جن کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا نبی علیہ السلام خاموش رہے اور آپ نے کوئی جواب نہیں دیا اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور آپ کو ان ستاروں کے نام بتائے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کو بلوایا اور فرمایا اگر میں تم کو ان ستاروں کے نام بتادوں تو تم مان لوگے اس نے کہاہاں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام بتائے **جربان الطارق الزبال ذوالکفین قابض وصاب امودان الفلیق المشبح الروج الایضا النور** اس یہودی نے کہا اللہ کی قسم ان ستاروں کے یہی نام ہیں۔[1]

نیند کی تعریف

جب موسرات خارجیہ منقطع ہو جاتے ہیں اور ہوا سے ظاہرہ صحتصال نہیں رہتا انسان انکھیں بند کر لیتا ہے اور اس کے اعضاڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ہوا کے ادرکات بتدریج منقطع ہو جاتے ہیں تو یہ وہ حالت ہے جس کو نیند سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خواب کی تعریف

حافظ شہاب الدین احمد ابن علی بن حجر عسقلانی متوفی 852 ہجری لکھتے ہیں اہل سنت کے نزدیک خواب کی صحیح تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالی سوئے ہوئے شخص کہ دل میں ادراکات پیدا کرتا ہے جیسا کہ بیدار شخص کے دل میں ادراکات پیدا کرتا ہے خواب میں جو ادرکات حاصل ہوتے ہیں کبھی ان میں فرشتے کا دخل ہوتے اور کبھی شیطان کا فرشتے کے دخل سے جو درخواہ حاصل ہوتے ہیں ان کے بعد انسان خوش ہوتا ہے اور شیطان کے دخل کے بعد جو ادرکات حاصل ہوتے ہیں ان کے بعد انسان غمگین ہوتا ہے اسی طرح تقریبا علامہ قرطبی نے بھی ذکر کیا ہے اس میں تھوڑا سا وضاحت زیادہ ہے۔[2]

خواب کی اقسام

علماء اسلام نے خواب کی حسب زیل اقسام بیان کی ہیں:

نمبر 1 بعض اوقات انسان کو نیند میں ایسی بے ربط اور خلاف واقعہ چیزیں نظر آتی ہیں جو لائق توجہ نہیں ہوتی مثلا انسان خواب میں یہ دیکھے کہ اسمان میں ایک طرف اگا ہوا ہے وغیرہ ایسے خوابوں کو اضغاث احلام کہتے ہیں اور اردو میں ان کو خواب پریشان کہتے ہیں بالکل جناب ہلنے نہیں دی ہے بیٹسمین کو دیکھیں علماء کہتے ہیں کہ اس قسم کے خواب شیطانی عمل کی وجہ سے نظر اتے ہیں اور اطباء کہتے ہیں کہ ہاضم کے خرابی یا بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے اس قسم کے خواب نظر اتے ہیں۔

---

[1] تبیان القرآن، ج۵، ص ۶۶۳

[2] امام ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، دار المعارف، بیروت، ۲۰۱۳، ج، ۱۲ص ۳۵۳

نمبر2 انسان جو کچھ سوچتا رہتا ہے وہ اس کو خواب میں نظر آتا ہے بعض اوقات وہ اپنی ناتمام خواہشوں کو خواب میں پورا ہوتے ہوئے دیکھتا ہے مثلاً بھوکا شخص خواب میں اپنی پسندیدہ چیزوں کو کھاتے ہوئے دیکھتا ہے وغیرہ اس قسم کے خواب نفس کے وسوسے اور نفس کے خیالات کہلاتے ہیں۔

نمبر3 کبھی سونے والے شخص کے منہ پر لحاف کا دباؤ ہوتا ہے جس سے اس کا سانس گھٹ رہا ہوتا ہے اور خواب میں دیکھتا ہے کہ کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے کبھی میدان کارزار میں ہے اور گولیاں چل رہی ہے وغیرہ اس قسم کے خواب دیکھ کر بعض اوقات وہ ڈر جاتا ہے اس قسم کے خوابوں کو محسوسات کا اثر کہا جاتا ہے۔

نمبر4 بعض اوقات انسان کے ذہن میں غیر شعوری خواہش ہوتی ہے جن کو وہ کسی کے احترام یا کسی اور معنی کی وجہ سے پورا کرنا نہیں چاہتا پھر اس کا خواب میں ایسی مثالیں نظر اتی ہے جن کی تعبیر بیانی ہی واقعہ نہیں ہو سکتی لیکن ان مثالوں میں کسی اور چیز کی طرف رمز اور اشارہ ہوتا ہے مثلاً باپ اپنے جوان بیٹے کو ماریں یا کسی ظالم بادشاہ کو قتل کر دیا وغیرہ خواب میں صرف اشارے اور رمز کی مثال سورہ یوسف کی یہ آیت ہے: اِذْقَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَعَشَرَ کَوْکَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ

ترجمہ جب یوسف نے اپنے والد سے کہا اے میرے ابا بے شک میں نے 11 ستاروں اور چاند کو دیکھا وہ مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں سورج اور چاند سے ان کے باپ اور ماں کی طرف اشارہ ہے اور 11 ستاروں سے ان کے 11 بھائیوں کی طرف اشارہ ہے اسے خواب کو رمزی خواب کہتے ہیں۔[1]

نمبر5 حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نیک شخص کا اچھا خواب نبوت کی چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔[2]

نمبر6 سچے خواب قرآن مجید میں چھ سچے خوابوں کا ذکر ہے ان میں سے چار سورہ یوسف میں ہے نمبر1 حضرت یوسف نمبر2 دو خواب قید خانہ میں دو قیدیوں کے نمبر3 دو قیدیوں کے حضرت یوسف کو سنانے کے نمبر4 بادشاہ کا خواب اور پانچواں خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آپ نے بیٹے کے بارے میں اور چھٹا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خواب کا ذکر ہے کہ مسلمان امن کے ساتھ عمرہ کر کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے۔[3]

نمبر7 بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں مستقبل میں ہونے والی کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہوتے ہیں سورہ یوسف میں جو چار خوابوں کا ذکر کیا گیا ہے ان چاروں میں اس کی مثالیں ہیں اور حدیث میں بھی اس کا ذکر ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ بیان کرتی ہیں کہ جب

---

[1] تبیان القرآن، ج۵، ص ۶۶۴

[2] صحیح بخاری حدیث نمبر 6983

[3] سورۃ الفتح:27

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا کی گئی تو سب سے پہلے آپ کو سچے خواب دکھائے گئے آپ جو خواب بھی دیکھتے ہیں اس کی تعبیر سپیدہ سحر کی طرح اجاتی ہے۔[1]

اچھے اور برے خوابوں کا شرعی حکم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جو اس کو پسند ہو تو وہ اللہ کے جانب سے ہے وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور وہ اس خواب کو بیان کرے اور جب وہ کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو شیطان کی طرف سے ہے وہ اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرے وہ خواب کسی کے سامنے نہ بیان کرے پھر وہ خواب اس کو ضرر نہیں دے گا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب اور بیداری میں زیارت[3]

من رآني في المنام فسيراني

حضرت ابو ہریرہ ضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے مجھ کو نیند میں دیکھا وہ عنقریب مجھ کو بیداری میں بھی دیکھے گا شیطان میری مثل نہیں بن سکتا۔[4]

اس حدیث کے تشریح میں حافظ ابو العباس احمد بن عمر المالکی القرطبی المتوفی 656ھ لکھتے ہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ انسان خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی حال میں بھی دیکھے آپ کو دیکھنا برحق ہے وہ کوئی پریشان خواب نہیں ہے جیسا کہ آپ نے خود فرمایا جس نے مجھ کو دیکھا اس نے یقینا مجھ ہی کو دیکھا اور آپ نے جو فرمایا ہے جس نے مجھ کو نیند میں دیکھا وہ عنقریب مجھ کو بیداری میں بھی دیکھے گا اس کے متعلق علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ نعمت مجھ کو کئی مرتبہ مل چکی ہے، آپ نے اپنا ایک واقعہ بھی ذکر کیا ہے۔[5]

چند خوابوں کی تعبیروں کے متعلق احادیث

بينانا نائم اتيت

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں سویا ہوا تھا تو مجھے خواب میں دودھ کا پیالہ دیا گیا، میں نے اس سے دودھ پی لیا حتی کہ میں نے دیکھا کہ میرے ناخنوں سے سیرابی نکل رہی ہے اور میں نے اپنا بچا ہوا دودھ عمر

---

[1] تبیان القرآن، ج۵، ص۶۶۵تا۶۶۶

[2] صحیح بخاری ۶۹۸۴

[3] تبیان ص666

[4] صحیح بخاری ۶۹۹۳

[5] تبیان ص۶۶۷

ابن خطاب کو دیا آپ کے گرد بیٹھے ہوئے صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا، یارسول اللہ! آپ نے دودھ سے کیا تعبیر لی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "علم"۔[1]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جس وقت میں سویا ہوا تھا میں نے خواب دیکھا کہ لوگ قمیض پہنے ہوئے میرے سامنے پیش ہو رہے ہیں بعض کی قمیض سینوں تک تھی اور بعض کی قمیص سے اس سے بھی کم تھی پھر عمر بن خطاب آئے اور ان کی قمیض پیروں کے نیچے گھسیٹ رہی تھی صحابہ نے پوچھا یارسول اللہ آپ نے قمیص سے کیا تعبیر لی ہے فرمایا دین۔[2]

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاکَ عَلٰٓی اِخْوَتِکَ فَیَکِیْدُوْا لَکَ کَیْدًا ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ[3]

بھائیوں کو خواب سنانے سے منع کرنے کا سبب

امام ابن جریر نے سدی سے روایت کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام جب شام آئے تو ان کی زیادہ توجہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی بن یامین کی طرف تھی اور جب ان کے بھائیوں نے حضرت یعقوب کی حضرت یوسف کی طرف زیادہ محبت دیکھی تو وہ حضرت یوسف سے حسد کرنے لگے اور جب حضرت یوسف نے یہ خواب بیان کیا کہ انہوں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو انہیں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تو والد نے حضرت یوسف علیہ السلام کو منع کیا کہ وہ اپنے بھائیوں کے سامنے یہ خواب بیان نہ کریں مبادا وہ ان کے خلاف کوئی سازش کریں۔[4]

خواب معلق ہونے کا مطلب

حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب سنانے سے اس لیے روکا کہ وہ آپ کے خلاف سازش کریں گے اور یہ سازش حسد کی وجہ سے ہو گا جامع البیان اس سے یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ اس شخص کے سامنے خواب نہ بیان کیا جائے جو شفیق اور خیر خواہ نہ ہو اور نہ اس شخص کے سامنے خواب بیان کیا جائے جو خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کا علم نہ رکھتا ہو صحیح حدیث میں ہے حضرت ابو زرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا خواب نبوت کے 40 اجزاء میں سے ایک جز ہے اور جب تک اس خواب کو بیان نہ کیا جائے یہ پرندے کی ٹانگ پر معلق ہوتا ہے اور جب اس کو بیان کر دیا جائے تو پھر یہ ساقط ہو جاتا ہے اور خواب صرف عقلمند شخص اور دوست کو بیان کیا جائے۔[5] امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے

---

[1] بخاری ح ۷۰۰۷

[2] بخاری ۷۰۰

[3] یوسف ۱۲:۵

[4] تبیان القرآن، ج ۵، ص ۶۶۷

[5] تبیان القرآن، ج ۵، ص ۶۷۳

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خواب کو قرار نہیں ہوتا (جیسے کوئی چیز پرندے کی ٹانگ پر لپیٹی جائے) یعنی جب تک اس کی تعبیر بیان نہ کر دی جائے اس کو قرار نہیں ہوتا (جیسا کہ پرندے کو اکثر حالات میں قرار نہیں ہوتا جو چیز اس کی ٹانگ پر معلق ہو اس کو کس طرح قرار ہو گا) اور جب اس کی تعبیر بیان کر دی جائے تو وہ ساقط ہو جاتی ہے۔

خواب کی غلط تعبیر بیان نہ کرنا

یعنی اگر کوئی خواب کی غلط تعبیر بیان کرے اس کے بارے میں کیا حکم ہے ا ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں امام مالک سے پوچھا گیا کہ کیا ہر شخص خواب کی تعبیر بیان کر سکتا ہے انہوں نے فرمایا کیا نبوت کو کھیل بنایا جائے گا اور امام مالکؒ نے فرمایا وہی شخص خواب کی تعبیر بیان کرے گا جس کو خواب کی تعبیر بیان کرنے کا علم ہو اگر اس کے نزدیک ایک خواب کی تعبیر اچھی ہو تو اس کو بیان کرے اگر اس کے نزدیک ایک خواب کی تعبیر بری ہو تو اس کو اچھی نصیحت کرے یا خاموش رہے۔[1]

سچے خوابوں کی بشارت ہونے کی تفصیل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا نبوت میں سے اب صرف بشارتیں باقی رہ گئی ہیں صحابہ نے پوچھا بشارتوں سے کیا مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سچے خواب سنن ابن ماجہ کی روایت میں ہے وہ خواب مسلمان خود دیکھتا ہے یا کوئی شخص اس کے لیے دیکھتا ہے۔[2]

یہاں ایک سوال ذہن میں آئے گا وہ یہ کہ سچے خواب دیکھنے والے میں نبوت کا ایک جز پایا جانے پر اس کو نبی کہا جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا جز اس چیز کے وصف کو مستلزم نہیں ہوتا مثلاً بلند آواز سے **اشھد لا الہ الا اللہ** پڑھنا آذان کا جز ہے لیکن جو آدمی صرف یہ کلمہ بلند آواز سے پڑھے اس کو موذن نہیں کہا جائے گا اس طرح اگر سچے خواب نبوت کا جز ہے لیکن سچے خوابوں کو دیکھنے والا کو نبی نہیں کہا جائے گا۔

خلاصہ بحث

حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کے بارے میں منتخب تین تفاسیر (معارف القرآن، ضیاء القرآن اور تبیان القرآن) کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ خواب نہ صرف ایک نبی کی عظمت و رفعت کی علامت تھا بلکہ آنے والے حالات اور ان کی تقدیرِ الٰہی کا اشاریہ بھی تھا۔

تفسیر معارف القرآن میں مفتی محمد شفیعؒ نے اس خواب کو نبوت کے منصب اور تعبیر الرؤیا کے علم کے آغاز سے مربوط کیا ہے۔ ان کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بشارت تھی کہ مستقبل میں وہ اپنے بھائیوں، والدین اور پوری قوم کے لیے عزت و سربلندی کا باعث ہوں گے۔ خواب کے ذریعے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انبیاء کے خواب وحی کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ بالکل سچے اور معتبر ہوتے ہیں۔ معارف القرآن میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ خواب کی تین اقسام ہیں: حدیث النفس، تسویل شیطانی اور الہامی خواب۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب تیسری قسم یعنی الہامِ ربانی تھا، جسے "جزء من النبوۃ" قرار دیا گیا۔ اس تفسیر میں صوفیائے کرام

[1] الجامع الاحکام القرآن جلد ۹ ص ۱۱۲

[2] صحیح بخاری، ح ۶۹۹۰

کے حوالے سے خواب کی ایک اور جہت کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ نفس انسانی کبھی عالم مثال سے متعلق ہو جاتا ہے اور وہاں کی صورتیں خواب میں جلوہ گر ہوتی ہیں، لیکن انبیاء کے خواب تمام عوارض سے پاک اور براہ راست وحی الٰہی کے مظہر ہوتے ہیں۔

تفسیر ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ الازہریؒ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کو ایک عظیم پیش خیمہ قرار دیا ہے جو ان کے مستقبل کے بلند مرتبے کی خبر دیتا ہے۔ اس خواب میں 11 ستارے، سورج اور چاند کے سجدہ کرنے سے مراد یوسف علیہ السلام کے بھائی اور والدین ہیں۔ پیر کرم شاہؒ کے نزدیک حضرت یعقوب علیہ السلام کی شدید محبت یوسف علیہ السلام کے اخلاق و کمالات کی وجہ سے تھی، اور اسی محبت کے باعث انہوں نے بیٹے کو نصیحت کی کہ خواب بھائیوں کو نہ سنانا کیونکہ حسد اور رقابت کے باعث وہ اس کے خلاف سازش کر سکتے ہیں۔ ضیاء القرآن میں "اجتباء" کے معنی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو اپنی خاص عنایت اور نبوت کے لیے چن لیا۔ اس خواب کے پس منظر میں یہ حقیقت بھی بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ بظاہر بھائیوں کی سازش یوسف علیہ السلام کے لیے مصیبت بنی، لیکن حقیقت میں یہی سازش انہیں مصر کے تخت تک پہنچانے اور ان کے خواب کی عملی تعبیر دکھانے کا ذریعہ بنی۔

تفسیر تبیان القرآن میں علامہ غلام رسول سعیدیؒ نے اس خواب کی شرعی اور فقہی پہلوؤں سے تفصیلی وضاحت کی ہے۔ انہوں نے نیند اور خواب کی تعریف، خواب کی اقسام اور ان کے شرعی احکام ذکر کیے ہیں۔ ان کے مطابق خواب تین طرح کے ہوتے ہیں: شیطانی، نفسانی اور رحمانی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب "رحمانی اور صادق خواب" تھا، جو نبوت کے اجزاء میں سے ہے۔ سعیدی صاحب نے یہ بھی واضح کیا کہ خواب ہر شخص کو بیان نہیں کرنا چاہیے، خصوصاً ان لوگوں کے سامنے نہیں جو حاسد ہوں یا جنہیں تعبیر کا علم نہ ہو۔ اسی لیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو نصیحت کی کہ وہ یہ خواب بھائیوں کو نہ بتائیں۔ تبیان القرآن میں بعض احادیث بھی نقل کی گئی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے خواب کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے اسے "نبوت کا ایک جز" قرار دیا۔ مزید برآں، سعیدی صاحب نے خواب کی تعبیر کے اصول بھی بیان کیے کہ اگر کوئی خواب اچھی تعبیر رکھتا ہے تو اسے ظاہر کیا جائے ورنہ خاموشی اختیار کی جائے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ خواب صرف اہل علم اور خیر خواہوں کے سامنے بیان کرنے چاہئیں تاکہ ان کی تعبیر نیک اور درست ہو۔

ان منتخب تفاسیر کا مجموعی مطالعہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب محض ایک خواب نہ تھا بلکہ اس میں ان کی زندگی کے بڑے واقعات اور اللہ کی طرف سے ملنے والی نعمتوں کی خبر تھی۔ یہ خواب نبوت کے منصب کی علامت، تعبیر الرؤیا کے علم کی بنیاد اور اللہ کی سنت کی عکاسی کرتا ہے کہ بظاہر انسان مشکلات اور آزمائشوں میں مبتلا ہو لیکن انجام کار اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کو عزت اور سربلندی عطا فرماتا ہے۔ یہ خواب دراصل اس بات کا بھی درس دیتا ہے کہ اللہ کے فیصلے حکمت سے خالی نہیں ہوتے اور خواب کبھی کبھی انسان کی آئندہ زندگی کے بڑے موڑوں کی جھلک دکھا دیتے ہیں۔

بادشاہ کا خواب منتخب تفاسیر کی روشنی میں

وَ قَالَ الْمَلِکُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍؕ-یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ۔قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۚ-وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ۔وَ قَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَ ادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ۔ یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍۙ-لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَی

النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا۔فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ۔ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ۔ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ۔[1]

ترجمہ: اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں موٹی ان کو کھاتی ہے سات گائیں دبلی اور ساتھ بالیں ہری اور دوسری سوکھی اے دربار والوں تعبیر کہو مجھ سے میرے خواب کی اگر ہو تم خواب کی تعبیر دینے والے بولے یہ خیالی خواب ہے اور ہم کو ایسے خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں اور بولا وہ جو بچا تھا ان دونوں میں سے اور یاد آگیا اس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو جا کر کہا اے یوسف اے سچے حکم دے ہم کو اس خواب میں سات گائیں موٹی ان کو کھائی ساتھ دبلی اور ساتھ بالیں ہری اور دوسرے سوکھی تا کہ لے جاؤں میں لوگوں کے پاس شاید ان کو معلوم ہو کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر سو جو کاٹو اس کو چھوڑ دو اس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ پھر آئیں گی اس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائیں گے جو رکھا تم نے ان کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے پھر آئے گا اس کے پیچھے ایک برس اس میں مینھ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔

تفسیر معارف القران[2]

خلاصہ تفسیر: اور بادشاہ مصر نے بھی ایک خواب دیکھا اور ارکان دولت کو جمع کر کے ان سے کہا کہ میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ساتھ گائیں فربہ ہیں جن کو سات لاغر گائیں کھا گئیں اور سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور ہیں جو کہ خشک ہیں اور خشک بالوں نے اسی طرح ان سات سبز پر لپٹ کر ان کو خشک کر دیا اے دربار والو اگر تم خواب کی تعبیر دے سکتے ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں مجھ کو جواب دو وہ لوگ کہنے لگے کہ اول تو یہ کوئی خواب ہی نہیں جس سے آپ فکر میں پڑیں یوں ہی پریشان خیالات ہیں اور دوسرے ہم لوگ امور سلطنت میں ماہر ہیں خوابوں کی تعبیر کا علم بھی نہیں رکھتے، دو جواب اس لیے دیے کہ اول جواب سے بادشاہ کے قلب سے پریشانی اور وسوسے دور کرنا ہے اور دوسرے جواب سے اپنا عذر ظاہر کرنا ہے خلاصہ یہ کہ اول تو ایسی خواب قابل تعبیر نہیں دوسرے ہم اس فن سے واقف نہیں اور ان مذکورہ دو قیدیوں میں سے جو رہا ہو گیا تھا وہ مجلس میں حاضر تھا اس نے کہا اور مدت کے بعد اس کو یوسف علیہ السلام کی وصیت کا خیال آیا میں اس کی تعبیر کی خبر لائی دیتا ہوں آپ لوگ مجھ کو ذرا جانے کی اجازت دیجئے چنانچہ دربار سے اجازت ہوئی اور وہ قید خانہ میں یوسف کے پاس پہنچا اور جا کر کہا اے یوسف اے صدق مجسم آپ ہم لوگوں کو اس خواب کا جواب یعنی تعبیر دیجئے کہ سات گائے موٹی ہیں ان کو سات دبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور اس کے علاوہ سات خشک ہیں کہ ان خشک کو لپٹنے سے وہ ہری بھی خشک ہو گئیں آپ تعبیر بتائے تا کہ میں جنہوں نے مجھ کو بھیجا ہے ان لوگوں کے پاس لوٹ کر جاؤں اور بیان کروں تا کہ اس کی تعبیر اور اس سے آپ کا حال ان کو بھی معلوم ہو جائے وہ تعبیر کے موافق عمل درامد کریں اور آپ کی خلاصی کی کوئی صورت نکلے اپ نے فرمایا کہ ان سات فربہ گائیوں اور سات سبز بالوں سے مراد پیداوار اور بارش کے سال ہیں بس تم سات سال متواتر خوب غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں ہی میں رہنے دینا تا کہ گھن نہ لگ جائے ہاں مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آوے وہ بالوں میں سے نکالا ہی جاوے گا پھر اس سات برس کے بعد سات برس ایسے سخت اور قحط کے آویں گے

[1] یوسف ۱۲:۴۹،۴۳

[2] معارف القرآن، ج۵، ص۷۳ تا۷۵

جو کہ اس تمام تر ذخیرہ کو کھا جاویں گے جس کو تم نے ان برسوں کے واسطے جمع کر کے رکھا ہو گا ہاں مگر تھوڑا سا جو بیج کے واسطے رکھ چھوڑ دو گے وہ البتہ بچ جائے گا اور ان خشک بالوں اور دبلی گائیوں سے اشارہ ان سات سالوں کی طرف ہے پھر اس سات برس کے بعد ایک برس ایسا آوے گا جس میں لوگوں کے لیے خوب بارشیں ہوں گی اور اس میں بوجہ اس کے انگور کثرت سے پھلیں گے شیرہ بھی نچوڑیں گے اور شرابیں پییں گے غرض وہ شخص تعبیر لے کر دربار پہنچا اور جا کر بیان کیا بادشاہ نے جو سنا تو آپ کے علم و فضل کا معتقد ہوا اور حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ چنانچہ یہاں سے قاصد چلا پھر جب ان کے پاس قاصد پہنچا اور پیغام دیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک میرا اس تہمت سے بری ہونا اور بے قصور ہونا ثابت نہ ہو جائے گا میں نہ آؤں گا۔[1]

مفتی شفیع صاحب نے جو تحقیق کی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر مختلف نوعیت کے خواب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور احادیث میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قدر تفصیل بیان فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوابوں کا وجود حق ہے انبیاء کرام کے علاوہ دیگر افراد کا خواب اگرچہ حجت شرعی نہیں تاہم یہ فیضان اور برکات نبوت سے ہے شاید ہی باری تعالی ہے یعنی وہ جو ایمان لائے اور پرہیز گار ہے ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی عزت اور مقبولیت کی بشارت ہے اور اخرت میں بھی مغفرت اور شفاعت یا دنیا میں بھی نیک خوابوں کی صورت میں پاکیزہ روحانی مشاہدات اور اخرت میں بھی اس کے متعلق جلوے اور دیدار

اللہ کے فرمان بدلہ نہیں کرتے یعنی وہ عظیم کامیابی ہے قرآن مجید نے واضح انداز میں خوابوں کے وجود کی صراحت کا ذکر کیا ہے خواب کے وجود کا انکار محض یہ کہہ کر کہ یہ وہم یا من گھڑت چیز ہے یا رویہ کا کوئی وجود نہیں ہے قرآن مجید اور حدیث پاک کے متعلق انکار ہے ایسا کہنا جہالت اور لاعلمی ہے کیونکہ خواب کے وجود اور تصور کا صراحتا انکار کر دینا کفر ہے اور دنیا کی بشارت کے متعلق روایت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ خواب تین طرح کے ہیں۔ دل کے خیالات، شیطان کا ڈرانا اور اللہ کی طرف سے خوشخبری۔ پس اگر کوئی شخص خواب میں بری چیز دیکھتا ہے تو اسے چاہئیے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے اور کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔[2] مفہوم سچی خوابیں جو انسان خود دیکھے یا ان کے لیے کوئی دوسرا دیکھے جن میں ان کے لیے خوشخبری ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت سے کمالات اور معجزات رب تعالی نے عطا فرمائے ان میں خوابوں کی تعبیر کا علم اور فن بطور خاص عطا فرمایا ان کا ذکر سورہ یوسف میں مذکور ہے مثلا بادشاہ مصر اور قیدیوں کے خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بیان ہوئے آپ نے ان کی تعبیر بیان فرمائی اور اس تعبیر کے متعلق ائندہ واقعات رونما ہوئے قرآن پاک میں جن خوابوں اور ان کی تعبیروں کا ذکر فرمایا ہے اس سے تعبیر خواب کے اصول بھی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

---

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۷۴

[2] بخاری ح۷۰۱۷

آیت مذکورہ میں یہ بیان ہے کہ پھر حق تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی رہائی کے لیے پردہ غیب سے وہ ایک صورت پیدا فرمائی کہ بادشاہ مصر نے ایک خواب دیکھا جس سے وہ پریشان ہوا اپنی مملکت کی تعبیر دینے والے اہل علم اور کاہنوں کو جمع کر کے تعبیر خواب دریافت کی وہ خواب کسی کی سمجھ میں نہ ایا سب نے یہ جواب دے دیا کہ اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ-وَمَانَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ

اضغاث احلام: اضغاث ضعث کی جمع ہے جو ایسے گٹھڑی کو کہا جاتا ہے جس میں مختلف قسم کے خس و خشاک گھاس بوس جمع ہو معنی یہ کہ یہ خواب کچھ ملی جلی ہے جس میں خیالات وغیرہ شامل ہیں اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے کوئی صحیح خواب ہوتا تو تعبیر بیان کرتے۔[1]

یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں دو نوجوان قید میں تھے جنہوں نے جیل میں خواب دیکھا تھا تو ان کے خواب کی تعبیر یوسف علیہ السلام نے دی تھی ان میں سے ایک بادشاہ کا ساقی بن گیا تھا اور یوسف علیہ السلام نے اس کو کہا تھا کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ اس طرح ایک گناہ بے گناہ جیل میں ہے وہ یہ بات بھول گئے تھے بادشاہ نے جب یہ خواب دیکھا تو اس کو یوسف علیہ السلام کے متعلق یاد آگیا اور بادشاہ کے پاس حاضر ہو کر سارا واقعہ سنا دیا بادشاہ نے اس کو بھیج دیا جب یہ گیا تو یوسف علیہ السلام نے اس کو نہ ڈانٹا اور نہ ملامت کی اس نے جب بادشاہ کا خواب سنایا یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کے تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی بتلا دی یہ واپس آکر بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتا دی تو بادشاہ نے کہا اس کو میرے پاس لے آؤ یہ دوبارہ گیا کہ بادشاہ آپ کو بلا رہے ہیں تو یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا بجائے نکلنے کے بعد کہ میرے بارے میں تحقیق کرو کہ ان عورتوں کا معاملہ کس طرح ہے جنہوں نے اپنی انگلیاں کاٹ دی تھی۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہاں پر یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کا ذکر کیا جنہوں نے اپنی انگلیوں کو کاٹا تھا اور عزیز کی بیوی کا نام نہیں لیا حالانکہ اصلی مجرمہ تو وہ تھی اس میں اس حق کی رعایت دی جو عزیز کے گھر میں پرورش پانے سے فطرت شریفہ انسان کے لیے قابل لحاظ ہے۔[2]

دوسری بات کہ اصل مقصود اپنے براءت کا ثبوت تھا اس کے ساتھ ہی یوسف علیہ السلام نے فرمایا ان ربي بكيدهن عليم یعنی میرا پروردگار تو ان کے جھوٹ اور مکر و فریب کو جانتا ہے میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ بھی حقیقت واقعہ سے واقف ہو جائے جس میں ایک لطیف انداز سے اپنی برات کا اظہار بھی ہے اس موقع پر صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ کے ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے اور پھر مجھے رہائی کے لیے بلا دیا جاتا تو فورا قبول کر لیتا اور امام طبری کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا صبر و تحمل اور مکارم اخلاق قابل تعجب ہے جب ان سے جیل میں بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کی گئی اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو تعبیر بتلانے میں یہ شرط لگاتا کہ پہلے جیل سے نکالو پھر تعبیر بتلاؤں گا پھر جب قاصد رہائی کا پیغام لایا اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو فورا جیل کے دروازے کی طرف چلتا۔[3]

---

[1] معارف القران، ج۵، ۷۲ تا ۷۸

[2] قرطبی، ج۵، ص ۱۳۵

[3] الجامع لاحکام القرآن، ج۵، ص ۱۳۵

منشاء حدیث کا: یوسف علیہ السلام کے صبر اور تحمل و مکارم اخلاق کی تعریف و مدح کرنا

مگر اس کے بالمقابل جس صورتحال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف منسوب کر کے فرمایا کہ میں ہوتا تو دیر نہ کرتا اس جملے کا مطلب کیا ہے اس کے بارے میں مفتی شفیع رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یوسف علیہ السلام کے اس طرز عمل کو افضل فرمارہے ہیں اور اپنی شان میں فرماتے ہیں کہ میں ہوتا تو اس سے افضل پر عمل نہ کر پاتا بلکہ اس کے مقابلے میں مفضول کو اختیار کر لیتا جو بظاہر افضل انبیاء کے شایان شان نہیں اس کے جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ تمام انبیاء میں افضل ہیں مگر کسی جزوی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کی منافی نہیں اس کے علاوہ جیسا تفسیر قرطبی میں فرمایا گیا ہے **افضل الاشیاء**[1] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریقہ کار میں ان کے صبر و تحمل اور مکارم اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہے اور وہ اپنی جگہ قابل تعریف ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طریقے کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیم امت اور خیر خواہی عوام کے لیے وہی مناسب اور افضل ہے کیونکہ بادشاہوں کا مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا جسے موجودہ دور میں ٹرمپ نے کہا اس لیے ایسے موقع پر شرطیہ شرطیں لگانا یا دیر کرنا عام لوگوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا اور نبی علیہ السلام تو ہے ہی رحمت اللعالمین۔[2]

تفسیر تبیان القرآن

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ-یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ۔[3]

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب ان آیات کی تحقیق میں نے ذکر کیا ہے کہ آیت میں بادشاہ سے مراد مصر کا بادشاہ ہے اور ان کا نام اس وقت ریان بن ولید تھا۔ اس نے مذکورہ خواب دیکھا اور ساتھ یہ ذکر کیا کہ اس خواب کے دیکھنے کے سبب کیا تھی وہ تھی دراصل یوسف علیہ السلام کی رہائی کا سبب غیبی طریقے سے یہ تین باتیں ہیں یہ بات ذکر کی ہے کہ جو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو پہلا خواب دیکھا تھا وہ ان کے لیے سختی اور مصیبت کا سبب بن گیا تھا اور بادشاہ کا یہ خواب ان کے لیے کشادگی اور رحمت کا سبب بن گیا۔[4]

اضغاث احلام: کا لغوی اور اصطلاحی معنی

ضغث کا معنی ہے بے ربط اور خلط ملت گھاس بوس کا مٹی بر مجموعہ اس میں مزید علماء کے اقوال مندرزیل ہیں:

ابو عبیدہ نے کہا جس خواب کو بہت لوگ دیکھیں ان کو جمع کر کے ایسا مجموعہ یا گھٹا بنالیا جائے جسے سوکھی ہوئی گھاس کا گھٹا ہوتا ہے اس سے مراد وہ خواب ہے جس کی تعبیر نہ بیان کی جا سکے الکسائی نے کہا کہ **اضغاث احلام** معنی ہے ملے جلے اور خلط ملط خواب۔

---

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۷۸

[2] تبیان القرآن، ج۵، ص۷۷۳

[3] یوسف:۴۳

[4] الجامع الاحکام القرآن ج۹، ص۷۴۵

ابن تیمیہ **اضغاث احلام** کا معنی ہے جس طرح آدمی مختلف گھاسوں کو ملا کر ایک گھٹا بناتا ہے اور اس میں طرح طرح کی گھاس ہوتی ہے اسی طرح جس خوابوں میں مختلف نوع کی باتیں دکھائیں دیں۔

الزجاج: نے کہا **اضغاث** کا معنی ہے کسی چیز کا گھٹا مثلاً سبزیوں یا ان جیسی چیزوں کا ان کی مراد یہ تھی کہ تم نے خواب میں چند ملی جلی چیزیں دیکھی ہیں یہ کوئی واضح خواب نہیں ہے اور ایسے ملے جلے خواب کی تعبیر کا ہمیں علم نہیں ہے۔

احلام "حلم" کی جمع ہے انسان نیند میں جو خواب دیکھتا ہے اس کو حلم کہتے ہیں یعنی بعض خواب صحیح ہوتے ہیں اور بعض باطل ہوتے ہیں۔[1]

یہاں پر اضغاث احلام کے متعلق اچھی تحقیق کی ہے بھوانہ علامہ نظام الدین حسن بن محمد القمی النیشاپوری المتوفی 728 ہجری لکھتے ہیں

اللہ تعالی نے نفس ناطقہ کو اس صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ وہ عالم افلاک تک پہنچ سکتا ہے اور لوح محفوظ کا مطالعہ کر سکتا ہے لیکن بیداری میں نفس ناطقہ بدن کی تدبیر اور حواس میں تصرف کرنے میں مشغول ہوتا ہے اس معنی کی وجہ سے وہ بیداری میں لوح محفوظ کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور نیند کے وقت یہ مشغولیات کم ہو جاتی ہیں تو نفس اس مطالعے پر قوی ہو جاتا ہے اور جب روح ان احوال میں سے کسی حال پر واقف ہو جاتی ہے تو اگر وہ احوال اس مشاہدہ کے مطابق خیال میں منقش ہو جاتے ہیں تو ان کی تعبیر میں کسی تاویل کی احتیاج نہیں ہوتی اور اگر ان احوال کی رموز یا ان کے اشارات خیال میں تو پھر ان کی تفسیر میں تاویل کی احتیاج ہوتی ہے پھر اگر وہ رموز اور اشارات مربوط اور اور منظم ہو تو ان سے حقائق روحانیہ کی طرف منتقل ہونا اور ان کی تاویل کرنا تفسیر کرنے والے کے لیے سہل اور اسان ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ رموز اور اشارات مختلت مضطرب اور غیر ہوتے ہیں اور ان کی تحلیل اور ان کا تجزیہ کرنا دشوار ہوتا ہے اور ان کی تالیف میں تشویش ہوتی ہے اور ان سے کسی چیز کی تصویر کشی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور ایسے ہی خوابوں کو **اضغاث احلام** کہا جاتا ہے۔[2] اور اس کا سبب یہ ہے کہ بدن کی قوتوں میں کسی فساد کی وجہ سے قوت متخیلہ میں تشویش پیدا ہوتی ہے یا خارج میں کسی غیر مانوس چیز سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کو اضغاث اس لیے کہتے ہیں کہ یہ تعبیر بیان کرنے والوں کو تھکا دیتی ہے۔[3]

قولہ تعالی: وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ۔

ترجمہ: ان دو قیدیوں میں سے جو نجات یافتہ تھا اس نے ایک مدت کے بعد یوسف کو یاد کیا اس نے کہا میں تم کو اس خواب کی تعبیر بتا سکتا ہوں مجھے یوسف کے پاس بھیج دو بعض علماء نے اسآیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ایک مدت کے بعد یوسف یاد ایا یہ ترجمہ اس نظریے پر مبنی ہے کہ شیطان نے ساقی کو بادشاہ کے سامنے بلا دیا تھا لیکن احادیث اثار اور قرآن مجید کے ظاہر الفاظ کا تقاضہ یہ ہے کہ شیطان نے حضرت یوسف

---

[1] علامہ نظام الدین حسن بن محمد القمی النیشاپوری، زاد المسیر، المکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۷ھ، ج ۴ ص ۲۳۰

[2] زاد المسیر، ص ۲۳۱

[3] تبیان ص ۷۷۵

علیہ السلام کو اللہ تعالی سے اس معاملے میں التجا اور ذکر کرنا بھلا دیا تھا اور انہوں نے ساقی سے کہا کہ وہ بادشاہ کے سامنے ان کی مظلومیت کا ذکر کرے اس لیے ہم نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اس نے ایک مدت کے بعد یوسف کو یاد کیا۔[1]

قولہ تعالی :یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ-لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ۔

ترجمہ :اس نے یوسف کے پاس جا کر کہا اے یوسف اے بہت سچ بولنے والے ہمیں اس خواب کی تعبیر بتایئے کے سات فربہ گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سر سبز خوشیں ہیں اور سات سوکھے ہوئے خوشے ہیں تا کہ میں لوگوں کے پاس جاؤں شاید وہ آپ کا مرتبہ جان لیں اس آیت میں تین باتیں مذکور ہیں نمبر 1 یہ کہ ساقی نے اس کو صدیق کہا یہ کیوں کہا نمبر 2 جس سے بندہ علم حاصل کرے اس کی تعظیم کرنا ضروری ہے نمبر 3 بادشاہ نے جو خواب بتایا تھا وہی الفاظ یوسف علیہ السلام کے سامنے ذکر کیے ساقی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو صدیق کہا اس لیے کہ وہ واقعی سچ بولنے والے تھے کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا تھا یہاں پر چند باتیں ذکر کرنا ضروری ہیں نمبر ایک صدق کی تعریف نمبر دو صدق میں تفاوت درجات نمبر تین صادق کا بیان نمبر چار صدوق کا بیان نمبر پانچ صدیق کی تعریف شاہ ولی اللہ اور صفت صدیق۔[2]

صدیق کی تعریف

وہ معرفت صدق کا عارف ہوتا ہے اور اس کے احوال اور اقوال اعظم و ارادہ مستقیم و احسن و قوی اور راسخ ہوتے ہیں اور اس کا واحد مقصود رضائے حق ہوتا ہے یہ وہ کمال ہے جو کمال نبوت سے ملا ہوا ہے یہ وہ سراج ہے جو چراغ نبوت سے روشن ہوتا ہے اللہ تعالی نے فرمایا **فَاُولٰٓىٕكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ۔**[3]

اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والوں کو اللہ تعالی کے انعام یافتہ بندوں یعنی انبیاء اور صدیقین کی معیت دی جائے گی ماخوذ منازل السالکین ابن قیم:

نمبر 1۔ صدق کی تعریف صدق کی مختصر تعریف یہ ہے کہ ظاہر و باطن یکساں ہوں۔

نمبر 2۔ صدق میں تفاوت درجات صدق سے یہی الفاظ بمعنی فاعل اتے ہیں صادق اور صدوق اور صدیق صادق سے صدیق کا درجہ بڑا ہے اور صدوق سے صدیق کا درجہ بڑا ہے۔

نمبر 3۔ صادق کا بیان صادق کے کل میں ایک ایسا داعیہ موجود ہوتا ہے جو کسی دباؤ یا روک سے دبتا ہے نہ رکتا ہے اس میں ایسی تڑپ پائی جاتی ہے جسے انقطاع نہیں ہوتا وہ ایسے عزم درست کا شخص ہوتا ہے جو ہر ایک معنی پر غالب اجاتا ہے اللہ تعالی نے فرمایا۔

---

[1] تبیان ص ۷۷۶

[2] قاضی سلیمان منصور پوری، الکمال الجمال، مکتبہ اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۹، ص ۱۸۳

[3] النساء:۶۹

نمبر4۔ یَاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوااتَّقُوااللّٰہَ وَکُوْنُوْامَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔[1]

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور صادقین کے ساتھ رہو ۔

نمبر5۔ صدوق کا بیان اعمال پر عمل کرنے کا مشتاق ہوتا ہے، کہ سامنے ہمیشہ آپ کا نفس وہ کمی کو محسوس کرتا ہے جو وہ زندگی صرف حق کے لیے پسند کیا کرتا ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ اگر دنیا میں جہاد اور نماز اور علم نافع کا وجود نہ ہو گا تو میں اس جہاں میں رہنا کبھی پسند نہ کرتا

شاہ ولی اللہ اور صفت صدیق

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صدیقیت سے بحث سے لطیف لکھی ہے انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ صدیق اصل فطرت میں ذات پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوتا ہے اور جو تعلیم نبی اللہ سے حاصل کرتا ہے اس کے دل میں ایسی راسخ ہو جاتی ہے گویا وہ علوم اسی کے دل سے نکلے تھے صدیق پر انوار وحی نبوت کا انعکاس ہوتا ہے وہ رود انوار سے تاثیر تاثر فعل و انفعال کا ایسا تسلسل قائم ہو جاتا ہے کہ صدیق فنا و فدا کے منصب پر ممتاز ہو جاتا ہے اور اس وقت یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نبی کی روحانیت صدیق کی زبان پر تکلم کیا کرتی ہے ۔[2]

صدیق کثیر الصدق و اتم الصدق

وہ شخص جس کے قول کی تائید اس کے فعل سے ہوتی ہے قرآن مجید میں یہ لقب شیخ الانبیاء ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی اتا ہے۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰھِیْمَ-اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًانَّبِیًّا۔[3]

حدیث پاک میں یہ لفظ شیخ الخلصائ الراشدین ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے سہل ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکر و عمر عثمان جبل احد پر تھے پہاڑ ہلا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اضبط احد فما علیک الا نبي وصدیق وشھید ان بہت ٹھہر جا تجھ پر نبی اور صدیق اور دو شہید بھی ہیں اس حدیث کی تائید قرآن مجید کی آیت والذي جاء بالصدق وصدق به۔[4]

کی تفسیر سے ہوتی ہے معالم التنزیل میں ابو العالیہ سے روایت ہے کہ جاء بالصدق رسول اللہ اور صدق به ابو بکر ہیں۔

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ الخ[5]

ان ایتوں میں یہ باتیں مذکور ہیں تعبیر یوسف علیہ السلام اور تدبیر بھی:

یوسف علیہ السلام کی محاسن ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے مکارم اخلاق۔

---

[1] توبہ:۱۱۹

[2] الجمال والکمال ص ۱۸۴

[3] سورہ مریم:۴۱

[4] الزمر:۳۳

[5] یوسف،۴۷تا۴۹

مستقبل کے لیے قومی ضرورت کے لیے ذخیرہ اندوزی کا جواز۔

خواب کا پہلی تعبیر پر واقع ہونا۔

تمام مقاصد حیات کے لیے شریعت کا متکفل ہونا۔

یہ سب باتیں جو یوسف علیہ السلام نے بیان کی یہ وحی کے ذریعے بتائی۔[1]

ان آیات سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بڑے ظرف اور مکارم اخلاق کا پتہ چلتا ہے آپ نے ساتھی کو تاکید سے کہا کہ وہ بادشاہ کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرے لیکن اس کے باوجود اس نے سات سال تک ذکر نہیں کیا اپنی ضرورت سے حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر پوچھنے گیا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے نہ ان کی سرزنش کی اور نہ ملامت بلکہ شرح صدر کے ساتھ خواب کی تعبیر بتا دی ساتھی کی ذکر نہ کرنے کی وجہ سے سات یا نو سال مزید قید میں رہنا پڑا اس میں اللہ کی طرف سے ایک حکمت تھی اور وہ یہ کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ مظلومیت کی خاطر رہا کر دیتے تو یہ بادشاہ کا اس پر احسان ہوتا اور یہ اللہ کو منظور نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کے زیر احسان رہے جب بادشاہ نے خواب دیکھا اور اس نے بندے کو بھیجا اور تعبیر بتا دی حضرت یوسف علیہ السلام نے تو ابھی یوسف علیہ السلام کا بادشاہ پر احسان رہا بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی بتا دی تو مصر کی پوری قوم حضرت یوسف علیہ السلام کے زیر احسان رہا۔

قومی ضرورت کے لئے ذخیرہ اندوزی کا جواز

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے اس آیت کریمہ کے ذیل میں قومی ضرورت کے لیے مستقبل میں ذخیرہ اندوزی کا جواز بھی دیا ہے یعنی اس میں معیشت کی اصلاح کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ خوشحالی اور غلہ کی پروانی کے سالوں میں ضرورت سے زیادہ غلہ کو خرچ نہ کریں اور بے تحاشہ خرچ کر کے ضائع نہ کریں بلکہ مستقبل میں انے والے قحط کے سات سالوں کے لیے غلہ کو بچا کر رکھیں اور اس میں یہ دلیل ہے کہ مستقبل کے لیے مال کو جمع کرنا یعنی ذخیرہ اندوزی کرنا مصلحت کے اعتبار سے ضروری ہے نیز اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ قومی ضرورت کے وقت ذخیرہ دوزی جائز ہے منع اس صورت میں ہے جب لوگ بھوکے مر رہے ہوں اور تاجر آپ نا نفع بڑھانے کے لیے اللہ کو گداموں میں چھپا کر رکھیں اور مارکیٹ میں فروخت کے لیے نہ لائیں۔[2]

خواب کی پہلی تعبیر پر واقع ہونا

بادشاہ کے درباریوں نے بادشاہ کے خواب کو اضغاث احلام قرار دیا تھا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کو با معنی قرار دیا اور اس کی تعبیر بتا دی اس سے معلوم ہوا کہ جو دوسرا شخص خواب کی تعبیر بتائے خواب اس پر بھی واقع ہو جاتا ہے اور ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ درج ذیل حدیث ضعیف ہے وہ یہ ہے حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خواب کا ایک باطن ہوتا ہے پس خواب کی تعبیر کنایہ سے اس کے نام سے بیان کرو خواب کی جو پہلی تعبیر بتائی جائے خواب اس پر واقع ہو جاتا ہے اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ اگر خواب میں مثلا سالم نام کے شخص کو دیکھو تو اس کی تعبیر سلامتی بیان کرو اگر کوے کو دیکھو تو اس کی تعبیر فاسق ہے

---

[1] الکمال والجمال، ص ۱۸۶

[2] تبیان القران ص ۷۷

کیونکہ حدیث میں کوے کو فاسق فرمایا ہے اور کنایہ سے مراد مثال ہے مثلاً کھجور کا درخت ہے تو اس کی تعبیر نیکی کرنے والا ہے۔[1] اس تشریح کے بعد علامہ غلام رسول سعیدی صاحب نے یہ ذکر کیا ہے کہ علامہ بوصیری نے کہا ہے اس حدیث کی سند میں یزید بن ابان رقاشی ہے اور وہ ضعیف ہے، حافظ ابن عسقلانی کے بھی اس حدیث کو یزد رقاشی کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔[2]

تمام مقاصد حیات کے لیے شریعت کا متکفل ہونا

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام تمام لوگوں کے لیے رحمت ہوتے ہیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر عقائد کی اصلاح کرتے ہیں مکارم اخلاق کی ہدایت دیتے ہیں تزکیہ نفوس کرتے ہیں اور معیشت اور اقتصادیات کی اصلاح کے لیے بھی رہنمائی کرتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے بتایا کہ غلہ کی فراوانی کے سات سالوں میں وہ کسی طرح آئندہ کے ساتھ سالوں کے لیے غلہ کو محفوظ رکھیں اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کا کام صرف دین کی حفاظت اور عبادت کا نظام قائم کرنا نہیں ہے بلکہ شریعت جان کی حفاظت کا بھی نظام قائم کرتی ہے اس لیے قصاص اور دیت کا نظام قائم کیا اور مال کی حفاظت کے لیے چوری اور ڈاکہ کی حدود مقرر کی عقل کی حفاظت کے لیے شراب کی حد مقرر کی نسب کی حفاظت کے لیے نکاح کا نظام قائم کیا اور زنا کی حد مقرر کی اور عزت کی حفاظت کے لیے حد قذف مقرر کی اور معیشت کی حفاظت اور اقتصادی حالت کو توازن پر رکھنے کے لیے زکوۃ اور عشر کا نظام قائم کیا اور احتکار کو ممنوع قرار دیا اور اسآیت میں قحط کے زمانے میں غلہ کو برقرار رکھنے کے طریقے کی رہنمائی کی غرض شریعت انسان کی اصلاح کے تمام پہلوؤں اور اس کے تمام مقاصد کی حفاظت کو محیط ہے اور اس پر عمل کرنے ہی میں دین اور دنیا کی فلاح ہے اسآیت سے دو باتیں مزید ثابت ہوئیں نمبر ایک یہ کہ کافر کا خواب بھی سچا اور صحیح ہوتا ہے اور اس کی تعبیر بھی سچی ہوتی ہے نمبر دو اس بات نبوت حضرت یوسف علیہ السلام کہ جو باتیں اس نے ان کو بتادی وہی کے ذریعے اور وہی پیغمبر کو ہوتی ہے اس لیے اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت بھی ثابت ہوئی کہ وہ اللہ کے نبی تھے۔[3]

خلاصہ بحث

حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب اور اس کی تعبیرات کو تین منتخب تفاسیر یعنی معارف القرآن، تبیان القرآن اور ضیاء القرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ خواب محض ایک نبی کی ذاتی کیفیت نہیں بلکہ ایک عظیم ربانی اشارہ اور ان کی مستقبل کی عظمت کی خبر تھا۔

تفسیر معارف القرآن میں مفتی محمد شفیعؒ نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا خواب وحی ربانی کا حصہ تھا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے خواب حقیقت اور صداقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ خواب میں گیارہ ستاروں، سورج اور چاند کے سجدہ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مستقبل میں ان کے والدین اور بھائی سب ان کے سامنے عاجزی کریں گے اور یہ اللہ کے نبی کے مقام و مرتبے کی علامت ہے۔ معارف القرآن کے مطابق یہاں سے

---

[1] سنن ابن ماجہ ص ۹۳۱۵، تبیان ج ۵، ص ۷۸

[2] فتح الباری، ج ۱۲، ص ۴۳۲

[3] تبیان ج ۵ ص ۷۷۸

یہ اصول بھی اخذ ہوتا ہے کہ خواب ایک الہامی اشارہ بن کر انسان کی زندگی کے بڑے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور انبیاء کے خواب بالکل حق اور سچے ہوتے ہیں۔

تفسیر ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہ الازہریؒ نے اس خواب کو یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی عظمت کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب یہ خواب سنا تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ بیٹے کی نبوت اور بلند مقام کی علامت ہے، مگر انہوں نے احتیاطاً یوسف علیہ السلام کو نصیحت کی کہ یہ خواب بھائیوں کو نہ بتانا کیونکہ ان میں حسد اور رقابت کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ضیاء القرآن میں یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ یوسف علیہ السلام کا خواب بعد میں حقیقت کا روپ دھارتا ہے، اور بظاہر بھائیوں کی سازشیں جو ایک مصیبت لگتی تھیں، درحقیقت اسی خواب کی تعبیر اور اللہ کی حکمت کے ظہور کا ذریعہ بنیں۔ اس تفسیر میں خواب کو ایک ربانی حکمت کے طور پر بیان کیا گیا ہے جو آزمائش کے پردے میں بلند درجات تک لے جاتی ہے۔

تفسیر تبیان القرآن میں علامہ غلام رسول سعیدیؒ نے خواب کی فقہی اور شرعی پہلوؤں سے تفصیل بیان کی ہے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ خواب تین اقسام کے ہوتے ہیں: نفسانی، شیطانی اور رحمانی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب تیسری قسم یعنی "رحمانی" اور "صادق خواب" تھا۔ اس تفسیر میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ خواب ہر کسی کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہیے، خصوصاً ان کے سامنے نہیں جو حسد یا کینہ رکھتے ہوں، اس لیے یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں سے بچانے کے لیے نصیحت کی۔ تبیان القرآن میں اس خواب کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی ذکر کی گئی ہیں جن میں خواب کو "جزء من النبوۃ" کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سعیدی صاحب نے خواب کی تعبیر کے اصول بھی بیان کیے کہ خواب کو صرف نیک نیت اور علم رکھنے والے کے سامنے ظاہر کرنا چاہیے تاکہ تعبیر درست اور خیر کے مطابق ہو۔

ان تینوں تفاسیر کا مجموعی جائزہ یہ بتاتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا خواب محض ایک ذاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک عظیم ربانی منصوبہ تھا۔ یہ خواب ان کی نبوت، بلند مرتبے اور آئندہ آنے والے حالات کی پیش گوئی کرتا ہے۔ معارف القرآن نے اسے وحی ربانی اور نبوت کا حصہ قرار دیا، ضیاء القرآن نے اسے حکمتِ الٰہی اور بلند درجات کا ذریعہ بتایا اور تبیان القرآن نے اس کے شرعی و فقہی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ یوں یہ خواب نہ صرف یوسف علیہ السلام کے لیے بلکہ پوری امت کے لیے یہ سبق رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں جو فیصلے ہوتے ہیں وہ ابتدا میں آزمائش اور مشکل کے طور پر سامنے آتے ہیں، مگر ان کا انجام عزت، سربلندی اور خیر پر ہوتا ہے۔

خلاصہ باب دوم

یہ باب دو فصلوں پر مشتمل ہے فصل اول تعلق باللہ اور معاشرتی مسائل اس میں چار مباحث ہیں نمبر ایک صبر کے متعلق نمبر دو علم نمبر تین توکل اور نمبر چار رجوع الی اللہ اس فصل میں ان چاروں چیزوں پر بحث ہوئی ہے۔ منتخب تفاسیر کی روشنی میں فصل دوم تعبیر رویا اور معاشرتی مسائل اس فصل میں دو مباحث ہیں نمبر ایک یوسف کا خواب نمبر دو بادشاہ کا خواب، ان دونوں فصلوں میں جن مباحث کا تحقیق منتخب تفاسیر کی روشنی میں ذکر کیا گیا ہے سب سے پہلے فصل اول میں صبر، علم، توکل اور رجوع الی اللہ اور دوسرے فصل میں خواب یوسف اور خواب بادشاہ کے متعلق سورہ یوسف میں مذکورہ آیات ذکر کیے ہیں ترجمہ اور خلاصہ تفسیر کے ساتھ اس کے بعد منتخب تفاسیر کی روشنی مزید تحقیق ذکر کی ہے۔

باب سوم

انفرادی، اجتماعی، معاشرتی اوراخلاقی مسائل ان کے اثرات

فصل اول: انفرادی، معاشرتی اوراخلاقی مسائل ان کے اثرات

انفرادی مسائل

حسد

﴿إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[1]

ترجمہ: "جب انہوں نے کہا: یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم ایک جتھے کی حیثیت رکھتے ہیں، بے شک ہمارا والد کھلی غلطی میں ہے۔"

یہ آیت سورہ یوسف کے آغاز میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے حسد اور رقابت کے جذبات کو واضح کرتی ہے۔ یہ ایک انفرادی نفسیاتی مسئلہ ہے جو بعد میں اجتماعی فساد میں بدل گیا۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت میں اپنی کمی محسوس کر رہے تھے۔ یہ احساس ان کے اندر حسد اور نفرت پیدا کرنے لگا، حتیٰ کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کی۔

تین نمایاں پہلو:

انسانی فطرت میں محبت اور قربت کی خواہش ہوتی ہے، لیکن جب کوئی یہ محسوس کرے کہ اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے تو حسد جنم لیتا ہے۔ یوسف کے بھائی یہ سمجھتے تھے کہ ہم زیادہ طاقتور ہیں، پھر بھی والد کی محبت یوسف اور بنیامین کی طرف زیادہ ہے، یہ احساس محرومی ان کے حسد کا سبب بنا۔

آیت کے آخر میں "إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ" اس بات کی دلیل ہے کہ حسد انسان کو اس حد تک اندھا کر دیتا ہے کہ وہ اپنے ہی والد پر الزام لگانے لگتا ہے۔ یہ ایک سنگین اخلاقی اور نفسیاتی مسئلہ ہے، کیونکہ اس میں خاندان کا احترام اور والدین کا مقام نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

معارف القرآن

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے دلوں میں حسد نے اس قدر اثر کیا کہ وہ اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی فطری محبت کو بھی ناانصافی اور "ضلال مبین" سمجھنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت کی وجہ یوسف اور بنیامین کی کمسنی، کمزوری اور ان کی اخلاقی و روحانی صلاحیتیں تھیں، نہ کہ کسی ناانصافی پر مبنی جھکاؤ۔ معارف

[1] یوسف ۱۲:۸

القرآن کے مطابق اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ حسد انسان کی عقل اور بصیرت کو ڈھانپ لیتا ہے، حتیٰ کہ وہ والد جیسے بزرگ ہستی پر بھی الزام تراشی کرنے لگتا ہے۔ مزید یہ کہ محبت اور التفات اللہ تعالیٰ کی فطری تقسیم ہے جسے انسانی خواہشات کے ترازو میں تولنا صحیح نہیں۔[1]

ضیاء القرآن

حضرت پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے دلوں میں حسد نے ایسا زہر گھول دیا کہ انہوں نے اپنے ہی والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو "ضلال مبین" پر قرار دیا۔ یہ دراصل حسد کا سب سے خطرناک پہلو ہے کہ یہ انسان کی بصیرت اور عدل پسندی کو ختم کر دیتا ہے۔ ضیاء القرآن کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت کوئی شخصی جھکاؤ نہیں بلکہ ایک فطری اور ربانی جذبہ تھا، کیونکہ یوسف اور بنیامین عمر میں چھوٹے اور اخلاق و کردار میں نمایاں تھے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ حسد انسان کو نہ صرف حق سے اندھا کر دیتا ہے بلکہ خاندان کے تقدس اور والدین کے احترام کو بھی پامال کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔[2]

تبیان القرآن

حضرت مفتی غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے دل میں حسد نے یہ وسوسہ ڈال دیا کہ والد اپنی محبت میں ان سے انصاف نہیں کر رہے۔ حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت کی اصل وجہ یوسف اور بنیامین کی کمسنی، کمزوری اور خصوصاً حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت کے آثار تھے۔ تبیان القرآن کے مطابق حسد انسان کی نظر کو اس قدر دھندلا دیتا ہے کہ وہ حقیقت کو مسخ کر کے اپنے ہی والد پر "گمراہی" کا الزام لگا بیٹھا۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ حسد نہ صرف دل کو بیمار کرتا ہے بلکہ خاندان کے امن و سکون کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ اس آیت سے سبق ملتا ہے کہ حسد انسانی معاشرت میں بگاڑ اور نفرت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔[3]

آیت میں "وَنَحْنُ عُصْبَةٌ" یعنی "ہم ایک طاقتور جماعت ہیں" کا جملہ ظاہر کرتا ہے کہ بھائی اپنے عددی اور جسمانی قوت پر فخر کرتے تھے، اور اسی کو بنیاد بنا کر وہ یوسف سے زیادہ محبت کے حقدار بننا چاہتے تھے۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی پہلو ہے جو انسانی معاشروں میں اکثر پایا جاتا ہے:

انسان اپنی صلاحیت یا حیثیت کی بنیاد پر محبت یا توجہ کا دعوے دار بننا چاہتا ہے، جبکہ محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے نہ کہ طاقت، عمر یا حیثیت سے۔

اس انفرادی مسئلے کے اثرات صرف ان کے دل کی حد تک محدود نہ رہے، بلکہ عملی اقدام کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ بھائیوں نے یوسف کو قتل کرنے یا کم از کم کہیں دور پھینک دینے کی سازش کی تاکہ وہ والد کی نگاہوں سے دور ہو جائے، اور یوں وہ "پھر "نیک بن جائیں:

﴿اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا ... وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ﴾[4]

---

[1] معارف القرآن، مفتی محمد شفیع عثمانی، ادارۃ المعارف، کراچی، جلد ۴، صفحہ ۳۷۹

[2] پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۰، جلد ۳، صفحہ ۴۴

[3] تبیان القرآن، مفتی محمد غلام رسول سعیدی، مکتبہ ضیاء القرآن، لاہور، جلد ۶، صفحہ ۴۷۲

[4] یوسف ۹:۱۲

یہ آیت ایک نفسیاتی دھوکہ بھی ظاہر کرتی ہے: انسان کبھی کبھار برائی کو نیکی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ یوسف کے بھائیوں نے پہلے غلط ارادہ کیا، پھر اس کے بعد "نیک" بننے کی بات کی، جو کہ اندرونی تضاد کی علامت ہے۔

سورہ یوسف کا یہ واقعہ ہمیں واضح سبق دیتا ہے کہ اگر انفرادی سطح پر حسد، رقابت، اور خود غرضی کو روکا نہ جائے تو یہ بڑے بڑے فتنے اور فساد کو جنم دے سکتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے دل کو صاف رکھے، اللہ کی تقسیم پر راضی رہے، اور محبت و عزت کے فیصلے دوسروں پر چھوڑ دے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سورہ الفلق میں فرماتے ہیں:

﴿وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾[1]

"اور حسد کرنے والے کے شر سے، جب وہ حسد کرے۔"

سورہ یوسف کی یہ آیت انسانی نفس میں چھپے ہوئے حسد جیسے خطرناک جذبات کو بے نقاب کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کس طرح انفرادی کمزوریاں معاشرتی و خاندانی نظام کو تباہ کر سکتی ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسد جیسے منفی رجحان سے بچ کر تقویٰ، رضا، اور توکل کی راہ اپنائے تاکہ اس کی زندگی بھی پُرامن ہو اور اس کا کردار دوسروں کے لیے رحمت کا باعث بنے۔

صبر

﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَ اللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ﴾[2]

"پس (اب میرے لیے) صبر ہی بہتر (راستہ) ہے، اور اللہ ہی ہے جس سے مدد چاہی جا سکتی ہے اس بات پر جو تم بیان کر رہے ہو۔"
یہ ایک باپ کے لیے نہایت صدمہ انگیز موقع تھا، لیکن ان کی زبان سے جو کلمات نکلے وہ انسانی تاریخ کے صبر و استقامت کے عظیم ترین نمونوں میں شمار ہوتے ہیں:

"فَصَبْرٌ جَمِيلٌ "یعنی "پس (اب میرے لیے) صبر ہی بہتر ہے۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام نے "صبر جمیل" کا لفظ استعمال کیا، جو قرآن میں صبر کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ یہ وہ صبر ہے جس میں شکایت کا پہلو نہ ہو، نہ زبان پر شکوہ، نہ دل میں بدگمانی، بلکہ مکمل رضا بالقضا ہو۔ یہ نبیوں کا صبر ہے، جو ایمان، رضا اور اللہ پر مکمل بھروسے کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب انسان پر ایسی مصیبت آئے جو بظاہر برداشت سے باہر ہو، تب بھی اس کا رویہ ایمان اور تسلیم و رضا پر مبنی ہونا چاہیے۔ حضرت یعقوب کا کردار ہر اُس انسان کے لیے نمونہ ہے جو کسی صدمے یا آزمائش کا شکار ہو۔

---

[1] الفلق ۱۱۳:۵

[2] یوسف ۱۲:۱۸

انسانی فطرت ہے کہ وہ دکھ اور صدمے میں بے قرار ہو جاتا ہے، لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کا کردار بتاتا ہے کہ حقیقی مؤمن اپنی اندرونی کشمکش کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔

"وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ[1]"

"جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس پر میں اللہ سے مدد چاہتا ہوں"۔

یہی وہ انفرادی رویہ ہے جو انسان کو انتقام، بدگمانی اور بے سکونی سے بچاتا ہے۔ آج کے معاشرے میں اکثر افراد دکھ یا ناکامی پر جلد ٹوٹ جاتے ہیں، مایوس ہو جاتے ہیں، یا دوسروں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں، جبکہ یعقوب علیہ السلام نے صبر اور دعا کو اپنا سہارا بنایا۔

یہ ایک انفرادی اصلاحی عمل ہے جو معاشرے میں بھی مثالی اثرات پیدا کرتا ہے۔ ایسے افراد جو دکھوں میں صبر اختیار کرتے ہیں، وہ دوسروں کے لیے بھی صبر و ہمت کا ذریعہ بنتے ہیں۔

تفسیر معارف القرآن

یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ صبر ایک وقتی کیفیت نہیں بلکہ مستقل مزاجی اور استقامت کا نام ہے۔ صبر جمیل وہی اختیار کر سکتا ہے جس کے دل میں توکل علی اللہ ہو اور جو یہ جانتا ہو کہ اللہ کی طرف سے آنے والی آزمائش حکمت پر مبنی ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نہ صرف ایک نبی بلکہ ایک والد بھی تھے، اور جب ایک والد اتنے شدید صدمے کے وقت "صبر جمیل" کی راہ اپناتا ہے تو یہ پورے معاشرے کے لیے عملی سبق بن جاتا ہے۔ آج کے معاشرتی حالات میں جہاں ذرا سی پریشانی پر لوگ شکوہ کناں ہو جاتے ہیں، وہاں یہ آیت ایک روحانی طاقت اور مثبت نفسیاتی رویے کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

سورہ یوسف کی یہ آیت ایک جامع تربیتی اصول دیتی ہے کہ آزمائشوں میں بے صبری یا بدگمانی سے بچ کر، مکمل اعتماد کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا طرزِ عمل انفرادی کردار سازی کی وہ اعلیٰ مثال ہے جس پر عمل کر کے ایک فرد نہ صرف اپنی زندگی سنوار سکتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی نمونہ بن سکتا ہے۔[2]

صبر جمیل صرف ایک قول نہیں، بلکہ ایک طرزِ حیات ہے، وہ طرز جو انسان کو اضطراب سے نجات دے کر سکون، استقامت اور اللہ کے قرب کی طرف لے جاتا ہے۔

ضیاء القرآن

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے غائب ہو جانے کی خبر پر "فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ" کہہ کر صبر کی اعلیٰ ترین مثال قائم کی۔ یہ وہ صبر ہے جس میں نہ شکوہ ہوتا ہے، نہ جزع فزع، بلکہ محض اللہ کی رضا پر راضی

[1] یوسف ۱۲:۱۸

[2] معارف القرآن، ج ۴، ص ۱۸

رہنا ہوتا ہے۔ پیر کرم شاہ رحمہ اللہ کے مطابق "صبر جمیل" انبیاء کا شیوہ ہے، کیونکہ وہ اپنی تکالیف کو اللہ کے حضور پیش کرتے ہیں، مخلوق کے سامنے نہیں۔ ساتھ ہی "وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ" یہ تعلیم دیتا ہے کہ صبر کے ساتھ ساتھ اللہ سے مدد مانگنا ہی حقیقی سہارا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مؤمن کا اصل سرمایہ مصیبت میں صبر اور اللہ پر کامل بھروسہ ہے۔[1]

تبیان القرآن

مفتی غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "فَصَبْرٌ جَمِيلٌ" کا مطلب ہے ایسا صبر جس میں زبان سے شکوہ نہ کیا جائے اور دل میں بے صبری نہ ہو، بلکہ پورے سکون اور رضا کے ساتھ اللہ کے فیصلے کو قبول کیا جائے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ صبر انبیاء کے خاص مقام کو ظاہر کرتا ہے، کیونکہ عام انسان دکھ میں بے قرار ہو جاتا ہے، مگر انہوں نے سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا۔ "وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ" کے ذریعے انہوں نے یہ تعلیم دی کہ حقیقی مدد صرف اللہ سے طلب کرنی چاہیے، کیونکہ وہی دلوں کو سکون اور غموں کو راحت عطا کرتا ہے۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مؤمن کے لیے آزمائش کے وقت بہترین راستہ صبر اور اللہ کی مدد پر بھروسہ ہے۔[2]

عفت و پاکدامنی

﴿قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ﴾[3]

"یوسف نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، بے شک وہ (میرے آقا) میرا اچھا ٹھکانا بنائے ہوئے ہیں، بے شک ظالم فلاح نہیں پاتے۔"

یوسف علیہ السلام نے سب سے پہلے اللہ کی پناہ لی:

"قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ"

"میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں"۔

یہی وہ پہلا عملی قدم ہے جو ہر صاحبِ ایمان شخص کو کسی گناہ یا فتنہ کے وقت اٹھانا چاہیے۔ جب انسان کا دل خدا سے جڑا ہوتا ہے تو وہ فطری طور پر برائی سے نفرت کرنے لگتا ہے، اور یہی پہلا دروازہ ہوتا ہے پاکدامنی کی راہ پر چلنے کا۔

یوسف علیہ السلام نے اپنی بات کی دلیل یہ دی کہ:

"إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ"

"یقیناً وہ (میرا آقا) میرے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔"

---

[1] ضیاء القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۲

[2] تبیان القرآن، جلد ۶، صفحہ ۴۸۰

[3] یوسف ۱۲:۲۳

یہ ایک غیر معمولی اخلاقی رویہ ہے کہ کسی کی بھلائی کے بدلے میں برائی نہ کی جائے۔ غلام ہونے کے باوجود یوسف علیہ السلام نے اس بات کو محسوس کیا کہ ان کے مالک نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے، اور ان کا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ وہ احسان کا بدلہ خیانت سے دیں۔ یہ طرزِ فکر آج کے معاشرے میں بے حد ناپید ہوتا جارہا ہے، جہاں فائدہ پرستی اور نفس پرستی غالب آچکی ہے۔

یوسف علیہ السلام نے واضح طور پر کہا:

"إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ"

"ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے"۔

یہ قول صرف زنا یا فحاشی کی مذمت نہیں بلکہ ہر طرح کی خیانت، بد دیانتی، اور نافرمانی کو ظلم قرار دیتا ہے۔ یہاں ظلم صرف کسی پر زیادتی نہیں بلکہ اللہ کے حکم کو توڑنا اور خیانت کرنا بھی ظلم ہے۔ یوسف علیہ السلام کا انکار انفرادی طور پر ان کی روحانی عظمت کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس کا اثر معاشرتی بھی ہے۔ اگر یوسف اس موقع پر برائی کے راستے پر چل پڑتے تو نہ صرف ایک برائی کو تقویت ملتی بلکہ خاندان، معاشرہ، اور عدل کے نظام میں بگاڑ آتا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ایک فرد کا کردار پورے معاشرے کو یا تو فلاح دے سکتا ہے یا فساد کا شکار کر سکتا ہے۔

آج کا دور وہ ہے جہاں میڈیا، فیشن، اور سوشل کلچر نے حیا و عفت کو کمزور کر دیا ہے۔ نوجوان نسل جسمانی کشش اور وقتی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر برائی کے دلدل میں جا گرتی ہے۔ ایسے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا کردار ایک زندہ مثال ہے کہ کس طرح نفس، ماحول، اور حالات کے خلاف لڑ کر پاکدامنی کو بچایا جا سکتا ہے۔

قرآن نے اس واقعے کو محفوظ کر کے ہر انسان کو یہ پیغام دیا ہے کہ پاکیزگی، حیا، اور اخلاقی وفاداری صرف مذہبی فریضہ نہیں، بلکہ عزت، سکون، اور فلاح کی بنیاد ہے۔ سورہ یوسف کی یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ انفرادی سطح پر جب انسان خدا کے خوف، شکر گزاری، اور اخلاقی وفاداری کو اپنا شعار بناتا ہے، تو وہ نہ صرف خود کو گناہ سے بچاتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی نیکی کا نمونہ بن جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی جوانی، طاقت، تنہائی اور آزمائش کے باوجود انکار کا فیصلہ ہر نوجوان کے لیے یہ پیغام دیتا ہے کہ "عفت اختیار کرنا ممکن ہے، اگر نیت خالص ہو اور دل میں اللہ کا خوف ہو۔"

معارف القرآن

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کی دعوتِ گناہ پر سب سے پہلے اللہ کی پناہ لی، کیونکہ ایمان کا پہلا تقاضا یہی ہے کہ بندہ برائی سے بچنے کے لیے رب کی حفاظت طلب کرے۔ "إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ" کے تحت وہ وضاحت کرتے ہیں کہ یہاں "ربی" سے مراد یوسف علیہ السلام کے آقا ہیں، جنہوں نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کیا تھا، اس لیے ان کے احسان کے بدلے خیانت کرنا بدترین ظلم ہوتا۔ پھر "إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ" کو عام اصول قرار دیا کہ کوئی بھی ظلم خواہ وہ فحاشی ہو، خیانت ہو

یا اللہ کی نافرمانی، کبھی کامیابی نہیں دلا سکتا۔ معارف القرآن کے مطابق یہ آیت ہر دور کے انسان کو یہ پیغام دیتی ہے کہ عفت و پاکدامنی اللہ کے خوف اور اخلاقی وفاداری سے ہی ممکن ہے۔[1]

ضیاء القرآن

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ اس آیت کی وضاحت کرتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے سب سے پہلے "مَعَاذَ اللّٰہِ" کہہ کر اعلان کیا کہ ایمان دار کے لیے سب سے مضبوط حصار اللہ کی پناہ ہے۔ "إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ" کے تحت وہ بیان کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے آقا کے حسنِ سلوک کو یاد کر کے یہ واضح کیا کہ کسی کے احسان کے جواب میں خیانت کرنا بدترین ناشکری ہے۔ یہ ایک اعلیٰ اخلاقی اصول ہے جو معاشرتی وفاداری اور اعتماد کی بنیاد ہے۔ پھر "إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ" کے ذریعے یہ ابدی اعلان کر دیا کہ بد دیانتی اور فحاشی صرف گناہ ہی نہیں بلکہ ظلم ہے، اور ایسا ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ضیاء القرآن کے مطابق یہ واقعہ آج کے نوجوان کے لیے زندہ مثال ہے کہ نفس اور ماحول کے دباؤ کے باوجود عفت و پاکدامنی ممکن ہے، اگر دل میں اللہ کا خوف ہو۔[2]

تبیان القرآن

مفتی غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا کی دعوتِ معصیت پر سب سے پہلے اللہ کی پناہ لی، کیونکہ حقیقی مؤمن کا پہلا ردعمل یہی ہوتا ہے کہ وہ گناہ کے موقع پر رب کی مدد طلب کرے۔ "إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ" کے تحت وہ وضاحت کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے آقا کی نیکی کو یاد کر کے یہ دلیل دی کہ کسی کے احسان کے بدلے خیانت کرنا ظلم اور بدترین ناشکری ہے۔ پھر "إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ" کے ذریعے انہوں نے اعلان کیا کہ ہر قسم کا ظلم، خواہ وہ زنا ہو یا خیانت، کبھی کامیابی نہیں لا سکتا۔ تبیان القرآن کے مطابق یہ آیت انسان کو یہ سبق دیتی ہے کہ عفت و پاکدامنی صرف مذہبی فریضہ نہیں بلکہ معاشرتی امن اور ذاتی کامیابی کی بنیاد ہے۔[3]

معاشرتی مسائل

خاندانی اختلافات

﴿إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ﴾[4]

"جب اُن (کے بھائیوں) نے کہا: یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم (ایک مضبوط) جماعت ہیں۔"

---

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۴۲۲۔

[2] ضیاء القرآن، جلد ۳، صفحہ ۶۵۔

[3] تبیان القرآن، جلد ۶، صفحہ ۴۸۵۔

[4] یوسف 8:12

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے دل میں پیدا ہونے والی وہ انفرادی منفی سوچ نمایاں کی گئی ہے جو بعد ازاں اجتماعی بگاڑ کی بنیاد بنی۔ یہ سوچ محض ایک جذباتی شکایت نہیں تھی، بلکہ حسد، ناراضگی، اور ناانصافی کا الزام اپنے باپ یعنی نبی اللہ پر لگا کر انہوں نے خاندان کے سکون کو توڑنے کا سبب بنایا۔ اس طرح کے خیالات جب دل میں جڑ پکڑ لیتے ہیں تو تعلقات میں دراڑ پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی یہ انفرادی حسد اور شکایت جب تک دل میں تھی، تب تک یہ ایک ذاتی مسئلہ تھا۔ مگر جب انہوں نے اس پر عملی سازش کی اور یوسف کو کنویں میں ڈال دیا تو یہ مسئلہ محض انفرادی نہ رہا بلکہ پورے خاندان کو ایک طویل المیے سے دوچار کر دیا۔ والد یعقوب علیہ السلام کا دکھ، یوسف کی جدائی، اور بھائیوں کی مسلسل جھوٹ بولنا یہ سب خاندانی بگاڑ کے وہ اثرات ہیں جو ایک چھوٹی سی منفی سوچ سے پیدا ہوئے۔ آج بھی معاشرتی سطح پر سب سے بڑا اخلاقی مسئلہ خاندانی ٹوٹ پھوٹ، وراثتی جھگڑے، اولاد میں جانبداری کا گمان اور بے اعتمادی ہے۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات جب دلوں میں دبائے جاتے ہیں تو وہ بڑی نفرتوں میں بدل جاتے ہیں، حتیٰ کہ بھائی بھائی کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ جب ایک فرد کی نیت خراب ہو جائے تو پورا خاندان اس کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔

معارف القرآن

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب یہ کہا کہ "یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں" تو یہ دراصل ان کے دل میں پیدا ہونے والا حسد اور بدگمانی تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی محبت میں کوئی ناانصافی نہ تھی بلکہ یوسف اور بنیامین کی کمسنی اور کمزوری، اور خصوصاً یوسف علیہ السلام کے اخلاق و روحانی کمالات اس محبت کا سبب تھے۔ لیکن بھائیوں نے اپنی خواہشات اور خود پسندی کی وجہ سے اس محبت کو جانبداری سمجھا اور والد پر "ضلال مبین" کا الزام لگا دیا۔ معارف القرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جب دل حسد اور بدگمانی سے بھر جاتا ہے تو انسان قریب ترین رشتوں کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے، اور یہی سوچ خاندان میں اختلافات اور بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ خاندانی تعلقات کی بقا کے لیے صبر، اعتماد اور حسنِ ظن بنیادی ستون ہیں۔[1]

ضیاء القرآن

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے والد کی محبت کو ناانصافی سمجھ کر حسد اور بدگمانی کو پروان چڑھایا۔ حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شفقت کی اصل وجہ یوسف اور بنیامین کی کمسنی اور کمزوری تھی، اور ساتھ ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی روحانی صلاحیتیں بھی نمایاں تھیں۔ پیر کرم شاہ رحمہ اللہ وضاحت کرتے ہیں کہ بھائیوں کی اس سوچ نے محض انفرادی حسد کو اجتماعی سازش میں بدل دیا اور پورے خاندان کو شدید آزمائش میں ڈال دیا۔ ان کے بقول یہ آیت بتاتی ہے کہ جب

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۳۷۹۔

گھر کے افراد والدین کے فیصلوں پر بدگمانی کرنے لگیں تو خاندانی تعلقات ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ضیاء القرآن یہ سبق دیتا ہے کہ خاندانوں میں محبت اور اعتماد قائم رکھنے کے لیے دلوں کو حسد اور خود غرضی سے پاک رکھنا ضروری ہے۔[1]

تبیان القرآن

مفتی غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے والد کی فطری محبت کو ناانصافی قرار دے دیا۔ دراصل حضرت یعقوب علیہ السلام کی شفقت کا سبب یوسف اور بنیامین کی کم عمری اور کمزوری تھی، اور خصوصاً یوسف علیہ السلام میں نظر آنے والی نبوت کی جھلک۔ مگر بھائیوں نے اس کو ذاتی محرومی کے چشمے سے دیکھا اور والد پر جانبداری کا الزام لگا دیا۔ تبیان القرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہ دراصل حسد اور بدگمانی کے پیدا کردہ خیالات تھے جنہوں نے خاندان کے امن کو برباد کر دیا۔ اس آیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب اولاد والدین کی محبت کو غلط زاویے سے دیکھنے لگے تو گھرانے میں اختلاف اور ٹوٹ پھوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا رشتوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ دل کو حسد اور شک سے بچایا جائے اور والدین کے فیصلوں پر اعتماد قائم رکھا جائے۔[2]

والدین کا احترام

﴿وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا﴾[3]

"اور اُس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے والدین کو تخت پر بلند جگہ بٹھایا، اور وہ (سب) اُس کے آگے سجدے میں گر پڑے۔"

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کا اپنے والدین کو تخت پر بٹھانا، نہ صرف ایک ظاہری عزت افزائی کا عمل ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم اخلاقی تعلیم چھپی ہوئی ہے۔ کئی سالوں کی جدائی، ظلم، قید اور تنہائی کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت، اقتدار اور سربلندی عطا کی، تو انہوں نے سب سے پہلے اپنے والدین کی تعظیم کی۔ یہ عمل والدین کی عظمت کا وہ مظہر ہے جو انسان کی انفرادی تربیت اور اخلاقی بلندی کی علامت ہے۔

یوسف علیہ السلام اس وقت مصر کے حاکم تھے۔ ان کے حکم کے تابع ہزاروں لوگ تھے، لیکن انہوں نے اقتدار کی بلند ترین چوٹی پر بھی اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور ان کے ساتھ احترام کا سلوک کیا۔ یہ عمل اُن افراد کے لیے سبق ہے جو دنیاوی مقام پا کر اپنے والدین کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کی اصل عظمت، والدین کے سامنے عاجزی اور ادب میں ہے، نہ کہ ظاہری اقتدار میں۔

اس منظر کی روحانی تاثیر یہ ہے کہ والد یعقوب علیہ السلام، جو برسوں بیٹے کی جدائی میں روتے رہے، آج اس کی عزت و وقار کے ساتھ استقبال سے اُن کا دل خوش ہو گیا۔ ماں باپ کے دل کو خوش کرنا، اُنہیں عزت دینا، اور ان کی موجودگی میں فخر محسوس کرنا معاشرتی لحاظ سے بھی ایک پُراثر پیغام ہے۔ ایسے افراد معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور خاندان میں وحدت، محبت اور برکت پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] ضیاء القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۴

[2] تبیان القرآن، جلد ۶، صفحہ ۴۷۲

[3] یوسف ۱۲:۱۰۰

اس آیت میں والدین سمیت سب افراد کا یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنا، زمانۂ شریعتِ سابقہ میں جائز تعظیمی سجدہ تھا۔ اسلام میں یہ جائز نہیں، مگر اصل نکتہ یہاں یوسف علیہ السلام کی عظمت سے زیادہ خاندان کے باہمی احترام اور محبت کا اظہار ہے۔ والدین کو بلند مقام دینا اللہ کی نظر میں اتنا عظیم عمل ہے کہ اسے قرآنی کہانی کا آخری منظر بنایا گیا، جو کہ سبق آموز ہے۔ یوسف علیہ السلام کی زندگی میں جو عظمت ہمیں نظر آتی ہے، وہ اچھے اخلاق، سچائی، صبر، عفت، اور والدین کے ادب کا مجموعہ ہے۔ جب انسان اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے تو اللہ اُسے عزت دیتا ہے، دل کو سکون دیتا ہے اور نسلوں میں خیر و برکت عطا فرماتا ہے۔ یہ انفرادی تربیت کا عروج ہے جسے قرآن نے بیان کیا۔

معارف القرآن

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب والدین کو تخت پر بٹھایا تو یہ عمل محض ایک رسمی احترام نہ تھا بلکہ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اولاد کی سب سے بڑی ذمہ داری والدین کی تعظیم اور ان کی خدمت ہے۔ کئی سالوں کی جدائی اور مصیبتوں کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو عزت اور اقتدار دیا تو انہوں نے سب سے پہلا حق والدین کا ادا کیا اور اپنی سلطنت کے اعلیٰ ترین مقام پر انہیں بٹھا کر یہ پیغام دیا کہ والدین کی عزت اولاد کے لیے سب سے مقدم ہے۔ مفتی شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "ورفع ابویہ علی العرش" کا مقصد صرف یوسف علیہ السلام کی عظمت کو بیان کرنا نہیں بلکہ یہ تعلیم دینا ہے کہ دنیاوی جاہ و جلال اور اقتدار کے باوجود والدین کی خدمت اور ان کی عزت ہی اصل کامیابی ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے بار بار والدین کے ساتھ حسن سلوک کو ایمان کے ساتھ جوڑا ہے، اس لیے یوسف علیہ السلام کا یہ عمل نبوت کے اعلیٰ اخلاق کا مظہر اور عملی نمونہ ہے۔[1]

ضیاء القرآن

پیر کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے والدین کو تخت پر بٹھانا دراصل والدین کے احترام اور عزت افزائی کا اعلیٰ ترین عملی مظہر ہے۔ یہ منظر اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندے اقتدار و سلطنت ملنے کے بعد بھی سب سے پہلے والدین کو فوقیت دیتے ہیں۔ پیر کرم شاہ فرماتے ہیں کہ "یوسف علیہ السلام نے والدین کو تخت پر بٹھایا تاکہ دنیا کو یہ بتایا جائے کہ والدین کا مقام اولاد کی سلطنت و حکومت سے بھی بلند ہے۔" مزید یہ کہ بھائیوں سمیت سب نے جب یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا تو یہ اس وقت کے شرع میں جائز تعظیمی سجدہ تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے یہاں ذکر کر کے والدین اور اہلِ خاندان کے باہمی احترام کی اہمیت اجاگر فرمائی۔ ضیاء القرآن کے مطابق یہ منظر صرف ایک خاندانی ملاقات نہیں بلکہ ایک عظیم اخلاقی درس ہے کہ والدین کی عزت کرنے والا اللہ کے نزدیک بھی عزت پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے قصے کا اختتام والدین کی تعظیم اور خاندان کے اتحاد پر کیا گیا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے واضح ہو جائے کہ حقیقی بلندی والدین کے ادب اور خدمت ہی میں ہے۔[2]

---

[1] معارف القرآن، جلد ۴، صفحہ ۴۹۷

[2] ضیاء القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۵۸

تبیان القرآن

حضرت علامہ غلام رسول سعیدی صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کو تخت پر بٹھا کر یہ واضح کیا کہ اولاد کی عزت اور اقتدار کی سب سے بڑی زینت والدین کا احترام ہے۔ کئی برس کی جدائی اور مصیبتوں کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سلطنتِ مصر کا حاکم بنایا تو انہوں نے اپنی پہلی ترجیح والدین کی تعظیم کو بنایا۔ اس عمل میں ایک عظیم سبق یہ ہے کہ بیٹے کی بلند ترین کامیابی بھی والدین کے احترام کے بغیر ادھوری ہے۔ مزید یہ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور اہلِ خاندان کا حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنا اُس دور کی شریعت میں جائز "سجدۂ تعظیمی" تھا، جسے آج کے شریعتِ محمدیہ میں منع کر دیا گیا ہے۔ تبیان القرآن وضاحت کرتا ہے کہ اصل مقصد اس سجدہ کا بیان نہیں بلکہ اس واقعے میں والدین اور خاندان کے باہمی احترام کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ حقیقی عزت والدین کی خدمت اور ان کی عزت افزائی سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ صرف دنیاوی طاقت اور منصب سے۔[1]

اخلاقی مسائل

امانت و دیانت

﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾[2]

یوسف نے کہا: مجھے ملک کے خزانے (یعنی مالی نظم) پر مقرر کر دیجیے، یقیناً میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم رکھنے والا بھی ہوں۔

حفظ (امانت داری)–وسائل کی حفاظت، خیانت سے اجتناب۔

علم (مہارت / دیانت علمی)–کام کی تکنیکی سوجھ بوجھ۔

جرأتِ حق گوئی–اپنی اہلیت بیان کرتے وقت نہ جھوٹ بولنا، نہ تکبّر؛ صرف حقیقت۔

یوسفؑ کا پہلا تعارف "حَفِیظٌ" ہے؛ یعنی ایسا نگہبان جو ذاتی لالچ یا دباؤ کے باوجود خزانے میں خیانت نہیں کرے گا۔ قرآن کریم متعدد مقامات پر امانت کو ایمان کا لازمی تقاضا قرار دیتا ہے (النساء 4 : 58؛ المؤمنون 23 : 8)۔ فرد کی یہ صفت اگر حکومتی سطح پر آجائے تو:

سرکاری کرپشن کا خاتمہ

عوام کا اعتماد–جب خزانے محفوظ ہوں تو لوگ ٹیکس دینے اور تعاون میں ہچکچاتے نہیں۔
معاشی استحکام–وسائل درست جگہ خرچ ہوں گے، ہنگامی حالات (قحط) سے نمٹنا آسان ہو گا۔
علیم سے مراد صرف دینی علم نہیں بلکہ پیشہ ورانہ تخصص بھی ہے۔ کسی منصب پر فائز شخص کی قابلِ ذکر خصوصیات:
تدبیر–سات زرخیز سالوں کی پیداوار ذخیرہ، پھر قحط کے سات سال نکالنا۔

---

[1] تبیان القرآن، جلد ۴، صفحہ ۲۳۳

[2] یوسف ۱۲:۵۵

اعداد و شمار کی مہارت– گندم کے ذخائر کی کفایتِ شعاری سے تقسیم۔
پیش بینی– مستقبل کے خطرات کا اندازہ اور بروقت منصوبہ بندی۔
یہ سکھاتا ہے کہ محض نیک نیتی کافی نہیں؛ بڑی امانتیں علمی اہلیت بھی مانگتی ہیں۔ آج کی زبان میں "میرٹ اور انٹیگریٹی" لازم و ملزوم ہیں۔
یوسفؑ نے اپنی صلاحیت بیان کی؛ یہ غرور نہیں تھا بلکہ حقِ خدمت کی طلب۔ اگر کوئی شعبہ ہماری مہارت کا متقاضی ہو اور ہم خاموش رہیں تو یہ بھی ایک درجۂ خیانت ہے۔ اسی لیے حدیث ہے:

» إذا ضُيِّعَتِ الأمانةُ فانتظر الساعة «[1]

جب امانت ضائع ہونے لگے (یعنی نااہل کو منصب ملے) تو قیامت کا انتظار کرو۔

شفاف نظمِ مالی– بدعنوانی رکے تو غریب کی فلاح کے منصوبے ممکن۔

مہنگائی میں اعتدال– ذخائر صحیح ہاتھوں میں ہوں تو ذخیرہ اندوزی اور کالا بازاری کم ہوتی ہے۔
انصاف پر مبنی معیشت– امانت دار منتظم طبقاتی فرق کو کم کر کے سماجی ہم آہنگی بڑھاتا ہے۔
سورہ یوسف دکھاتی ہے کہ ایک فرد کی دیانت پوری سلطنت کے اقتصادی ڈھانچے کو قحط سے بچا سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسلامی فقہ اور سیاست میں حکمران کی تقرری کے دو بنیادی معیار "قوی" اور "امین" بیان ہوئے (القصص 28 : 26)۔
میرٹ بیسڈ سلیکشن– اہم معاشی عہدوں پر صرف وہ جن کے دامن پر کرپشن کا دھبہ نہ ہو اور جو فیلڈ کے ماہر ہوں۔
آڈٹ اور جواب دہی– یوسفؑ نے شفاف نظام قائم کیا؛ آج ادارہ جاتی نگرانی لازمی ہے۔
اخلاقی تربیت– تعلیمی نصاب میں "دیانت" بطور قدر؛ فقط ٹیکنیکل ٹریننگ کافی نہیں۔
خدمت کا شعور– ملازمت کو "خزائنِ ارض" کی نگہبانی سمجھنا، ذاتی کمائی کا ذریعہ نہیں۔

معارف القرآن

حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے بادشاہ سے کہا: ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾ یعنی "مجھے ملک کے خزانے (یعنی مالی نظم) پر مقرر کیجیے، یقیناً میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم رکھنے والا بھی ہوں۔" (یوسف: 55)۔ معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی دو صفات بطور دلیل پیش کیں؛ پہلی "حفیظ" یعنی امانت دار، جو ذاتی خواہشات، لالچ اور دباؤ سے متاثر نہیں ہو گا، اور دوسری "علیم" یعنی وہ علم اور تجربہ جو قحط کے زمانے میں مالی و معاشی منصوبہ بندی کے لیے ضروری ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ منصب و عہدہ صرف نیک نیتی یا تعلقات کی بنیاد پر نہیں بلکہ دیانت و مہارت دونوں کی بنیاد پر ملنا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی صلاحیت بیان کرنا غرور نہیں بلکہ خدمتِ خلق اور امانت کی ادائیگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے دوسری جگہ

[1] صحیح البخاري، کتاب العلم، حدیث نمبر: ۵۹

حکومتی تقرری کے لیے بنیادی اصول "قوی" اور "امین" (القصص:26) قرار دیا۔ اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جہاں فرد کی دیانت لازمی ہے وہاں اس کی عملی مہارت بھی ناگزیر ہے، کیونکہ دونوں کے امتزاج سے ہی ایک شفاف اور مضبوط نظام وجود میں آسکتا ہے۔[1]

ضیاء القرآن

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ پیر محمد کرام شاہ الازہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے ملک کے خزانے اپنے لیے نہیں مانگے بلکہ امت کی فلاح اور قحط سالی سے تحفظ کے لیے یہ ذمہ داری طلب کی۔ "حفیظ" کا مطلب ہے ایسے امانت دار منتظم جو خیانت، کرپشن اور ذاتی مفاد سے پاک ہو، جبکہ "علیم" سے مراد تدبیر، منصوبہ بندی اور اقتصادی شعور ہے۔ اس سے یہ اصول نکلتا ہے کہ بڑے عہدے صرف نیک نیتی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اہلیت اور دیانت دونوں کی بنیاد پر دیے جانے چاہییں۔ یوسف علیہ السلام کا اپنی قابلیت بیان کرنا کوئی خودستائی نہیں بلکہ شرعی طور پر اپنی اہلیت ظاہر کرنا خدمتِ دین و خلق کے لیے ضروری تھا۔ ضیاء القرآن واضح کرتا ہے کہ معاشرتی نظام اس وقت درست ہو سکتا ہے جب حکمران اور منتظمین "قوی" اور "امین" ہوں، یعنی نہ صرف دیانت دار بلکہ ماہر اور اہل بھی ہوں۔ یہی قرآن کا وہ سنہری اصول ہے جس پر عادلانہ نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔[2]

تبیان القرآن

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ آپؑ نے ملک کے خزانوں کی ذمہ داری اس لیے مانگی کہ آنے والے قحط کے دنوں میں مصر اور گرد و نواح کے لوگوں کو بھوک اور تباہی سے محفوظ رکھا جاسکے۔ یہاں "حفیظ" سے مراد امانت داری اور دیانت ہے، یعنی وہ شخص جو ذاتی مفاد یا خیانت کے بغیر وسائل کی حفاظت کرے۔ جبکہ "علیم" سے مراد انتظامی مہارت، منصوبہ بندی اور معاشی بصیرت ہے۔ حضرت یوسفؑ کا اپنی صلاحیت کا اظہار کرنا تکبر نہیں تھا بلکہ خدمتِ خلق اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے اپنی اہلیت واضح کرنا تھا۔ اس آیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ عہدے اور مناصب صرف نیک نیت لوگوں کو نہیں بلکہ ان اہل لوگوں کو دیے جائیں جو دیانت کے ساتھ ساتھ فنی مہارت بھی رکھتے ہوں۔ تبیان القرآن کے مطابق اگر حکومتی اور معاشی ذمہ داریاں نااہل افراد کے سپرد کر دی جائیں تو یہ بڑی خیانت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے منصب کے لیے بنیادی شرائط "قوی" اور "امین" قرار دیں (القصص:26)۔[3]

معافی اور درگزر

﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾[4]

"آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔"

---

[1] معارف القرآن، ج۴، ص۴۱۳

[2] ضیاء القرآن، ج۳، ص۴۹۷

[3] تبیان القرآن، ج۴، ص۱۸۱

[4] یوسف ۱۲:۹۲

یہ الفاظ حضرت یوسفؑ نے اس وقت اپنے بھائیوں سے کہے جب وہ اپنے ظلم وزیادتی کا اعتراف کر کے یوسفؑ کے سامنے شرمندہ کھڑے تھے۔ انہوں نے یوسفؑ کو کنویں میں پھینکا، ان کی زندگی کو برباد کرنے کی کوشش کی، مگر جب قدرت نے یوسفؑ کو اقتدار عطا فرمایا تو انہوں نے بدلہ لینے کے بجائے معافی اور درگزر کا راستہ اختیار کیا۔

یہاں یوسفؑ کو انتقام لینے کا مکمل اختیار تھا:

بھائیوں نے زیادتی کی تھی

والدین کو تکلیف دی تھی

یوسفؑ کو غلامی، جیل، اور تنہائی کا سامنا کرنا پڑا

لیکن حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

"لَاتَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ"[1] — آج تم پر کوئی ملامت نہیں

یہ قرآن کا اخلاقی کمال ہے: انسان کی عظمت صرف بدلہ لینے میں نہیں بلکہ درگزر میں ہے۔

دل کا سکون: معاف کرنے والا شخص انتقامی جذبات سے آزاد ہو جاتا ہے۔

روحانی بلندی: یوسفؑ کا یہ عمل اُن کی نبوت کی اعلیٰ اخلاقی شان کو ظاہر کرتا ہے۔

قربِ الٰہی: قرآن میں بارہا ذکر ہے کہ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔[2]

رشتہ داروں کے جھگڑوں میں درگزر کا رویہ اپنائیں۔

قائدین انتقامی سیاست کے بجائے اصلاحی رویہ اختیار کریں۔

معاشرتی نفرتوں اور دشمنیوں کا خاتمہ صرف عفو و درگزر سے ممکن ہے۔

عداوت کو محبت میں بدلنے کا ہنر نبوت سے سیکھا جائے۔

سورہ یوسف کی یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ معاف کرنا کمزوری نہیں بلکہ بلند ظرفی ہے۔ یوسفؑ نے جن بھائیوں کو دنیاوی و اخلاقی لحاظ سے گرا ہوا چھوڑا تھا، اُنہی کو محبت، معافی اور حکمت سے دوبارہ خاندان کا حصہ بنا کر معاشرے میں خیر کا سبب بنا دیا۔ معافی اور درگزر ایک ایسا اخلاقی عمل ہے جو فرد کے دل کو صاف کرتا ہے، خاندان کو جوڑتا ہے، اور معاشرے کو پرامن بناتا ہے۔

---

[1] یوسف ۱۲:۹۲

[2] الشوریٰ ۴۳:۴۲

معارف القرآن

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کو عفو و درگزر کی بلند ترین مثال قرار دیا گیا ہے۔ بھائیوں نے ان کے ساتھ انتہائی سخت سلوک کیا: انہیں کنویں میں ڈالا، غلام بنا دیا گیا، قید کی مشقتیں برداشت کیں اور والدین کو غمگین کیا، لیکن جب قدرت نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اقتدار بخشا تو انتقام کے بجائے فرمایا: ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ یعنی "آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے" (یوسف: 92)۔ مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ عفو نبی کریم ﷺ کے اسوہ کی جھلک ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے بھی فتح مکہ کے موقع پر اپنے دشمنوں سے یہی الفاظ ارشاد فرمائے۔ یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ انبیاء کا شیوہ بدلہ لینا نہیں بلکہ دلوں کو جوڑنا ہے۔ درگزر سے نہ صرف فرد کا دل سکون پاتا ہے بلکہ خاندان ٹوٹنے کے بجائے جڑتا ہے اور معاشرہ امن و محبت کا گہوارہ بن جاتا ہے۔[1]

ضیاء القرآن

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس فرمان کو عظیم اخلاقی مثال اور انبیاء کے حلم و کرم کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ بھائیوں نے ان پر ظلم کیا، جدائی اور قید کی صعوبتوں کا سامنا کروایا، مگر اقتدار کے وقت انتقام لینے کے بجائے فرمایا: "آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے" (یوسف: 92)۔ علامہ پیر محمد کرام شاہ الازہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کا یہ عفو و درگزر ان کے نبوی کردار کی بلندی ہے، جس میں نفس کی خواہشات پر قابو اور اللہ کی رضا مقدم ہے۔ اس رویے نے نہ صرف بھائیوں کے دلوں میں ندامت اور اصلاح پیدا کی بلکہ خاندانی رشتوں میں محبت کو بحال کیا۔ ضیاء القرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہی طرزِ عمل نبی کریم ﷺ نے بھی فتح مکہ کے موقع پر اپنایا، جس سے یہ ثابت ہوا کہ قیادت کی اصل عظمت درگزر اور دلوں کو جوڑنے میں ہے، نہ کہ انتقام میں۔[2]

تبیان القرآن

اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی سنگین زیادتیوں کے باوجود معافی اور درگزر کا وہ طرزِ عمل اپنایا جو صرف انبیاء اور کامل اہلِ ایمان کا شیوہ ہے۔ جب بھائی اپنے جرم کے اعتراف کے ساتھ شرمندہ کھڑے تھے تو آپؑ نے فرمایا: "آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے" (یوسف: 92)۔ مولانا غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ یہ الفاظ صرف معافی نہیں بلکہ تسلی اور حوصلہ بھی تھے تاکہ بھائیوں کے دلوں سے خوف اور ندامت ختم ہو جائے۔ اس واقعے سے یہ سبق ملتا ہے کہ عفو و درگزر نہ صرف فرد کے اخلاقی وقار کو بلند کرتا ہے بلکہ خاندانی رشتوں میں محبت اور معاشرتی تعلقات میں استحکام پیدا کرتا ہے۔ تبیان القرآن

---

[1] معارف القرآن، ج ۴، ص ۴۲۹

[2] ضیاء القرآن، ج ۳، ص ۵۱۲

اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ اصل طاقت انتقام میں نہیں بلکہ معاف کر کے دشمن کو دوست بنانے میں ہے، یہی انبیاء کی سنت اور قیادت کا حقیقی کمال ہے۔[1]

احسان اور نیک سلوک

﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾[2]

"بے شک جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر سے کام لیتا ہے، تو اللہ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔"

سورہ یوسف کی آیت نمبر 90 میں حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک جامع اصول بیان کیا: "بے شک جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر سے کام لیتا ہے، تو اللہ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔" یہ قول اس وقت کا ہے جب حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو پہچاننے کے بعد اپنے اوپر کیے گئے مظالم کا بدلہ لینے کے بجائے ان سے نرمی سے پیش آئے۔ یہ آیت انفرادی سطح پر انسان کے رویے اور اس کے انجام پر ایک گہرا اثر ڈالتی ہے، کیونکہ اس میں نیکی، صبر، اور تقویٰ کو زندگی کا معیار بنانے کا درس موجود ہے۔

معارف القرآن

اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے مظالم کو یاد رکھنے کے بجائے صبر و تقویٰ کا عملی ثبوت دیا اور اسی کو کامیابی کا راز قرار دیا۔ اس آیت سے یہ اصول واضح ہوا کہ تقویٰ انسان کو گناہوں اور زیادتیوں سے بچاتا ہے جبکہ صبر مشکلات اور آزمائشوں میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے محسن بندوں کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرتا، چاہے دنیا میں انہیں وقتی طور پر تکلیف پہنچے۔ حضرت یوسفؑ کا طرزِ عمل بتاتا ہے کہ نیکی اور بھلائی کا بدلہ لازماً ملتا ہے، اگر فوراً نہ بھی ملے تو آخرت میں ضرور ملے گا۔ معارف القرآن کے مطابق یہ آیت دراصل انسان کو صبر، تقویٰ اور احسان کے ذریعے اعلیٰ اخلاقی مقام تک پہنچنے کا راستہ دکھاتی ہے اور یہ تعلیم دیتی ہے کہ مشکلات کے باوجود نیکی پر قائم رہنے والا کبھی محروم نہیں رہتا۔[3]

ضیاء القرآن

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول دراصل اُن کی پوری زندگی کا نچوڑ ہے۔ انہوں نے تقویٰ کے ذریعے گناہوں اور لغزشوں سے دامن بچایا اور صبر کے ذریعے آزمائشوں کا سامنا کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف انہیں اقتدار اور عزت عطا کی بلکہ ان کے بھائیوں کے دل بھی اُن کے سامنے جھک گئے۔ ضیاء القرآن کے مطابق "محسنین" وہ ہیں جو اپنے نفس پر قابو رکھتے ہیں، دوسروں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں اور ہر حال میں اللہ سے راضی رہتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ نے

---

[1] تبیان القرآن، ج ۴، ص ۱۹۵

[2] سورہ یوسف ۱۲:۹۰

[3] معارف القرآن، ج ۴، ص ۴۶۴

یہ اعلان کر کے دراصل آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیا کہ کامیابی طاقت یا انتقام میں نہیں بلکہ صبر، تقویٰ اور احسان میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی نیکی کو ضائع نہیں کرتا بلکہ اس کا بدلہ کئی گنا بڑھا کر عطا فرماتا ہے۔[1]

تبیان القرآن

مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی زندگی کے عملی تجربات سے یہ حقیقت بیان کی کہ اللہ کی طرف سے ملنے والی عزت اور کامیابی کا راز صبر اور تقویٰ میں پوشیدہ ہے۔ انہوں نے جوانی میں بھی گناہوں سے اجتناب کیا، غلامی اور قید کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور بھائیوں کے ظلم پر بدلہ لینے کے بجائے درگزر کا راستہ اپنایا۔ تبیان القرآن کے مطابق "محسنین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو صبر اور تقویٰ کی بنیاد پر دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کو مقصد بناتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا یہ فرمان دراصل اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے اجر کو ہرگز ضائع نہیں کرتا بلکہ دنیا و آخرت میں ان کے درجات بلند کرتا ہے۔[2]

منتخب تفاسیر کی روشنی میں انفرادی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل ان کے اثرات

سورہ یوسف ایک جامع اور عمیق اخلاقی و معاشرتی پیغام کی حامل سورت ہے، جس میں انسانی زندگی کے کئی انفرادی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ تفسیر معارف القرآن، ضیاء القرآن اور تبیان القرآن کی روشنی میں اگر اس سورت کا تجزیہ کیا جائے تو متعدد اخلاقی مسائل اور ان کے اثرات سامنے آتے ہیں۔

معارف القرآن میں سورہ یوسف کو صبر، عفت، معافی، اور تقویٰ کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ حضرت یوسف کی کردار میں انفرادی سطح پر عفت و پاکدامنی (عورت کی دعوت معصیت کو رد کرنا)، صبر (قید و جلاوطنی پر) اور معاف کر دینے میں صفات واضح ہیں۔ یہ تفسیر اس بات پر زور دیتی ہے کہ اگر فرد نیکی اور صداقت پر قائم رہے تو معاشرہ خود بخود دامن، عدل اور روحانی بلندی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔[3]

ضیاء القرآن (از پیر کرم شاہ الازہری) میں سورہ یوسف کے معاشرتی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، خصوصاً خاندانی حسد، جھوٹ، اور بے انصافی جیسے مسائل پر۔ حضرت یوسف کے بھائیوں کا حسد اور سازش، پھر کنعان سے مصر تک کے سفر میں سیاسی اور سماجی تبدیلیاں یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ معاشرتی اخلاقیات کے بگاڑ سے پورے خاندانوں اور قوموں میں فساد پیدا ہو سکتا ہے۔ اس تفسیر میں باپ (یعقوب) اور بیٹے (یوسف) کے رشتے کی پائیداری کو اخلاقی استقامت کی علامت قرار دیا گیا ہے۔[4]

---

[1] ضیاء القرآن، ج۳، ص ۵۷۲

[2] تبیان القرآن، ج۴، ص۴۹۸

[3] معارف القرآن، ج۴، ص ۹۰

[4] تفسیر ضیاء القرآن، ج۳، ص

تبیان القرآن (علامہ غلام رسول سعیدی) میں سورہ یوسف کو اخلاقی تربیت کی مکمل داستان" کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ یہاں خاص طور پر سوسائٹی میں سچائی، دیانت داری، اور جنسی پاکیزگی جیسے اصولوں پر زور دیا گیا ہے۔ عزیز مصر کی بیوی کی طرف سے بدکاری کی دعوت، اور حضرت یوسف کا انکار یہ اس بات کی مثال ہے کہ ایک فرد کا اخلاقی رویہ، پورے سماج پر اثر ڈال سکتا ہے۔ اصلاحی صاحب نے اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ انسان کو جذبات پر قابو رکھنا سیکھنا چاہیے، ورنہ وہ اپنے آپ اور معاشرے کے لیے مخطرہ بن جاتا ہے۔[1]

خلاصہ بحث

خلاصہ یہ ہے کہ تینوں تفاسیر میں سورہ یوسف کو انفرادی و اجتماعی اخلاقیات کا جامع نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ ہر تفسیر نے اپنے انداز میں یہ واضح کیا کہ افراد کی اخلاقی پختگی سے ایک مہذب، صالح اور خدا پر بھروسہ رکھنے والا معاشرہ جنم لیتا ہے، اور بد اخلاقی، حسد، جھوٹ اور خیانت جیسے عوامل خاندانوں کو تباہ اور قوموں کو گرا سکتے ہیں۔

سورہ یوسف میں انفرادی سطح پر سب سے نمایاں مسئلہ حسد کا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حسد کی بنیاد پر اپنے حقیقی بھائی کے خلاف ایسا سنگین جرم کیا جو ایک بڑے اخلاقی بگاڑ کی مثال ہے۔ "إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا" (یوسف 12:8) میں ان کا یہ کہنا کہ "یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ عزیز ہیں" اس بات کی دلیل ہے کہ انفرادی نفسیاتی بگاڑ نے انہیں ایسے گناہ کی طرف مائل کیا جو نہ صرف ذاتی طور پر ان کے لیے تباہ کن تھا بلکہ خاندانی تعلقات کو بھی متاثر کر گیا۔ معارف القرآن میں اس مقام پر مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں کہ یہ حسد اور خود کو بڑا سمجھنے کا فطری میلان جب قابو سے باہر ہو جائے تو انسان کو ظلم پر آمادہ کر دیتا ہے، جو کہ ایمان اور تقویٰ کے منافی ہے۔

حضرت یوسفؑ کا کنویں میں پھینکا جانا، بازارِ مصر میں غلام بنا کر بیچنا، اور بعد ازاں قید ہونا ایسے معاشرتی مسائل کو نمایاں کرتے ہیں جو ظلم، ناانصافی، اور طبقاتی استحصال جیسے اجتماعی امراض کو ظاہر کرتے ہیں۔ سورہ یوسف ان واقعات کے ذریعے معاشرتی ناہمواری، طاقتور طبقات کے ظلم، اور مظلوموں کی بے بسی کو بیان کرتی ہے۔ معارف القرآن میں ان واقعات کی تفسیر کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ جب معاشرے میں عدل و انصاف کا نظام کمزور پڑ جائے اور ذاتی مفادات اجتماعی ضمیر پر غالب آ جائیں، تو اس سے معاشرتی انتشار جنم لیتا ہے۔ یوسفؑ کو قید میں ڈالنا اس بات کی علامت ہے کہ جھوٹے الزامات اور طاقت کے غلط استعمال سے معاشرے کے نیک لوگ بھی متاثر ہو سکتے ہیں، جو کہ ایک خطرناک علامت ہے۔

سورہ یوسف میں اخلاقی پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ حضرت یوسفؑ کا زلیخا کے فتنہ سے بچنا اور کہنا: "قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ" (یوسف 12:23) نہایت بلند اخلاقی معیار کی علامت ہے۔ معارف القرآن کے مطابق حضرت یوسفؑ کا یہ رویہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اگر تقویٰ اور حیاء کے ساتھ زندگی گزارے تو فتنوں میں بھی پاکدامن رہ سکتا ہے۔ اسی طرح ان کا بھائیوں کو معاف کر دینا "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ" (یوسف 12:92) ایک ایسی اخلاقی بلندی ہے جو دلوں کو جوڑتی ہے اور معاشرتی مفاہمت کو جنم دیتی ہے۔ معافی، احسان، اور امانت جیسے اخلاقی اوصاف صرف فرد کو بلند نہیں کرتے بلکہ پورے معاشرے میں خیر اور ہمدردی کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔

[1] تبیان القرآن، ج۵، ص۸۴۳

سورہ یوسف، تفسیر معارف القرآن کی روشنی میں، نہ صرف ایک عظیم الشان واقعہ بیان کرتی ہے بلکہ انفرادی حسد، معاشرتی ظلم، اور اخلاقی انحطاط جیسے مسائل کے اسباب اور ان کے اثرات کو واضح کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صبر، تقویٰ، احسان، معافی اور دیانت جیسے اخلاقی اصولوں کو اپنانے کا عملی درس بھی دیتی ہے۔[1]

انفرادی حسد، رقابت، خود پسندی، اور والد کی محبت پر اعتراض جیسے نفسیاتی اور اخلاقی مسائل کو ظاہر کرتی ہے۔ "تبیان القرآن" میں مفتی غلام رسول سعیدیؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ انسان جب اپنے دل کو حسد سے پاک نہ رکھے تو وہ اپنے قریبی عزیزوں کے خلاف بھی انتقام پر اتر آتا ہے۔ بھائیوں کا حضرت یوسفؑ کو کنویں میں ڈالنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انفرادی منفی جذبات اگر قابو سے باہر ہو جائیں تو وہ ظاہری دشمنی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جس کا اثر پورے خاندان پر پڑتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انفرادی اصلاح نہ ہو تو وہ اجتماعی خرابی کا باعث بنتی ہے۔

حضرت یوسفؑ کا غلام بنا کر بازارِ مصر میں بیچا جانا، اور بعد ازاں جھوٹے الزام کے تحت قید کیا جانا ایک معاشرتی ناانصافی اور اخلاقی زوال کا مظہر ہے۔ "تبیان القرآن" کے مطابق حضرت یوسفؑ کا بازار میں فروخت ہونا اس وقت کے ظالمانہ سماجی ڈھانچے کی عکاسی کرتا ہے، جہاں ایک انسان کو اس کی مرضی کے بغیر بیچ دیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ زلیخا جیسے بااثر طبقے کا ناحق الزام لگا کر کسی بے گناہ کو قید کروا دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ جب طاقتور افراد معاشرتی اصولوں کو پامال کرتے ہیں تو مظلوم طبقہ ناانصافی کا شکار ہو جاتا ہے۔ تبیان القرآن کے مطابق ایسے ماحول میں عدل، انصاف اور معاشرتی تحفظ کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کا فتنۂ زلیخا کے وقت کہنا ﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ (یوسف 12:23) اور قید میں صبر سے رہنا، اعلیٰ اخلاق کا مظہر ہے۔ تبیان القرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے پاکدامنی، صبر، اور اللہ پر اعتماد جیسے اوصاف کا مظاہرہ کیا جو ہر انسان کے لیے ایک مثالی کردار پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح جب انہوں نے اپنے بھائیوں کو معاف کیا: ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (یوسف 12:92) تو تبیان القرآن کے مطابق یہ اخلاقی بلندی اور درگزر کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ یہ رویے نہ صرف فرد کو سرفراز کرتے ہیں بلکہ معاشرے میں مفاہمت، رواداری اور خیر خواہی کو فروغ دیتے ہیں۔

تبیان القرآن کی روشنی میں سورہ یوسف صرف ایک قصہ نہیں بلکہ ایک جامع تربیتی سبق ہے جو انفرادی کردار سازی، معاشرتی عدل، اور اخلاقی بلندی کا پیغام دیتا ہے۔ اگر افراد حسد اور تکبر سے بچیں، معاشرتی انصاف کو فروغ دیں، اور اعلیٰ اخلاق کو اپنائیں تو ایک پرامن، متوازن اور فلاحی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔[2]

ضیاء القرآن کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب انسان کے دل میں حسد پیدا ہو، تو وہ نہ صرف اپنے اہلِ خاندان بلکہ والد جیسی محترم ہستی کی محبت پر بھی شک کرتا ہے، جیسا کہ یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا: "اِنَّ اَبَانَا لَفِی ضَلَالٍ مُّبِیْنٍ"۔ پیر کرم شاہؒ لکھتے ہیں کہ انفرادی حسد

---

[1] مفتی محمد شفیعؒ، معارف القرآن، جلد 4، سورہ یوسف کی تفسیر، مکتبہ دارالعلوم کراچی

[2] مفتی غلام رسول سعیدی، تبیان القرآن، سورۃ یوسف کی تفسیر، مکتبہ نعیمیہ لاہور، جلد: ۵ ص ۸۴۶

اگر کنٹرول نہ کیا جائے تو وہ انسان کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے، اور یہ مرض نہ صرف فرد کو تباہ کرتا ہے بلکہ خاندانی اور اجتماعی نظام کو بھی متاثر کرتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کا قافلے کے ہاتھوں بیچا جانا، بازار میں غلام کی حیثیت سے پیش کیا جانا اور بعد ازاں جھوٹے الزام پر قید ہونا، اس وقت کے معاشرتی بگاڑ کو ظاہر کرتا ہے۔ ضیاء القرآن میں پیر کرم شاہؒ فرماتے ہیں کہ مصر کا معاشرہ طبقاتی فرق اور ظلم پر مبنی تھا، جہاں ایک پاکباز نوجوان کو محض مفادات یا جھوٹے الزام پر قید کر دیا جاتا تھا۔ یہ سب ظاہر کرتا ہے کہ جب معاشرتی نظام عدل و مساوات سے خالی ہو جائے، تو مظلوم کے لیے کوئی پناہ نہیں رہتی۔ حضرت یوسفؑ کی قید بھی ایک معاشرتی ناانصافی کا مظہر ہے، اور ان کے ساتھ روا رکھا گیا سلوک معاشرتی ضمیر کی موت کی علامت ہے۔

سورہ یوسف میں حضرت یوسفؑ کا کردار اعلیٰ ترین اخلاقی معیار کی نمائندگی کرتا ہے۔ جب زلیخا نے انہیں دعوتِ گناہ دی، تو انہوں نے فرمایا: ﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ (یوسف 12:23) ضیاء القرآن کی تشریح کے مطابق یہ جملہ ان کی عفت، پاکدامنی اور خدا خوفی کا مظہر ہے۔ پیر کرم شاہؒ لکھتے ہیں کہ جوانی، حسن، خلوت اور اقتدار کی حامل عورت کی دعوت کے باوجود انکار کرنا ایک عظیم اخلاقی بلندی ہے۔ اسی طرح جب بھائیوں نے ان سے معافی مانگی، تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا: ﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ (یوسف 12:92)

یہ درگزر، احسان، اور بھائی چارے کی اعلیٰ مثال ہے۔ ایسے اخلاق نہ صرف فرد کو عظمت عطا کرتے ہیں بلکہ معاشرے میں رحمت، الفت اور اخوت کو پروان چڑھاتے ہیں۔

ضیاء القرآن کی روشنی میں سورہ یوسف انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے جامع ہدایت فراہم کرتی ہے۔ انفرادی طور پر حسد، غرور اور نفس کی خواہشات کو قابو میں رکھنا، معاشرتی طور پر عدل و انصاف کو قائم رکھنا، اور اخلاقی طور پر عفت، درگزر اور احسان کو اپنانا وہ بنیادی ستون ہیں جن پر ایک فلاحی معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔[1]

[1] سورۃ یوسف کی تفسیر، ضیاء القرآن، جلد: ۳ ص ۴۵۴

فصل دوم: اجتماعی معاشرتی اخلاقی مسائل اور ان کے اثرات

اجتماعی مسائل:

اجتماعی بگاڑ:

﴿إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[1]

ترجمہ: "جب انہوں نے کہا: یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کے نزدیک ہم سے زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ ہم ایک جتھے کی حیثیت رکھتے ہیں، بے شک ہمارا والد کھلی غلطی میں ہے۔"

یہ آیت نہ صرف اجتماعی بگاڑ کی بنیاد کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا یہ جملہ خاندانی نظام میں انتشار اور اجتماعی خرابی کے آغاز کو بیان کرتا ہے۔

"وَنَحْنُ عُصْبَةٌ" (ہم ایک مضبوط گروہ ہیں) یہ اس بات کی علامت ہے کہ اجتماعی طاقت کا غلط استعمال کس طرح اخلاقی انحراف کو جنم دیتا ہے۔ بھائیوں نے اپنی جسمانی طاقت اور تعداد پر گھمنڈ کرتے ہوئے غلط اقدام کا فیصلہ کیا، جو معاشرتی توازن کو بگاڑنے والا عمل تھا۔

انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام پر یہ الزام لگا دیا کہ وہ "کھلی گمراہی" میں ہیں۔ یہ ایک سنگین اجتماعی مسئلہ ہے کہ جب خاندان کے افراد بدگمانی اور الزام تراشی کا شکار ہو جائیں تو گھر کا امن تباہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی سوچ خاندانی نظام کو کمزور کرتی ہے اور نسلوں میں نفرت کے بیج بوتی ہے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ جب حسد کو کنٹرول نہ کیا جائے تو وہ صرف انفرادی حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ اجتماعی فیصلوں کو متاثر کرتا ہے۔ بھائیوں نے گروہی مشورے سے یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کی، جو بعد میں جھوٹ، دھوکہ اور حتیٰ کہ قتل کے منصوبے تک جا پہنچی۔ یہ اجتماعی فساد کا ایک عملی نمونہ ہے۔

سورہ یوسف بتاتی ہے کہ ایسے اجتماعی رویے کس طرح معاشرتی اعتماد اور تعلقات کو تباہ کر دیتے ہیں۔ خاندان کے افراد کا ایک دوسرے کے خلاف متحد ہونا معاشرتی انتشار کو جنم دیتا ہے، اور یہی بگاڑ پوری معاشرت میں بے اعتمادی، بدامنی اور ظلم کا سبب بنتا ہے۔ یہ آیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ معاشرتی سطح پر حسد، جتھہ بندی، اور والدین کے فیصلوں پر اعتراض جیسے عوامل کس طرح اجتماعی فساد کو جنم دیتے ہیں۔ قرآن ایسے رویوں سے اجتناب کی تعلیم دیتا ہے تاکہ معاشرتی نظام عدل، محبت اور اعتماد پر قائم رہ سکے۔

اس آیت میں حضرت یوسفؑ کے سوتیلے بھائیوں نے حسد کی بنیاد پر ایک خطرناک سوچ اپنائی کہ چونکہ حضرت یوسفؑ اور ان کا بھائی حضرت بنیامینؑ والد کے زیادہ محبوب ہیں، اس لیے والد (حضرت یعقوبؑ) گمراہی میں مبتلا ہیں یہ سوچ در حقیقت حسد، احساسِ محرومی اور خاندان

[1] یوسف ۱۲:۸

میں مساوات کی کمی کے باعث پیدا ہوئی، جس نے بھائیوں کے دلوں میں بغض اور انتقام کو جنم دیا۔

یہاں ہمیں خاندانی نظام میں محبت، عدل اور تدبیر کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے، ورنہ افرادِ خاندان باہمی نفرت میں مبتلا ہو کر پورے معاشرتی ڈھانچے کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ جب افراد خود کو نظر انداز شدہ محسوس کریں اور دوسروں کو ناجائز فائدہ یافتہ سمجھنے لگیں تو اجتماعیت میں اعتماد، خیر خواہی اور باہمی ربط ختم ہو جاتا ہے۔ اس آیت سے ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ اگر رہنما یا خاندان کا سربراہ محبت و حکمت سے افراد کی تربیت نہ کرے، تو گھر یا معاشرہ حسد، فتنہ، اور فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی بگاڑ آگے چل کر سازشوں، جھوٹ، ظلم اور خاندانی ٹوٹ پھوٹ کا سبب بنتا ہے، جس کی مثال آگے کی آیات میں بھی تفصیل سے ملتی ہے۔

معارف القرآن

اس آیت کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حسد دراصل خاندانی بگاڑ کی جڑ تھا۔ انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ پر ناانصافی کا الزام لگایا اور اپنی جماعتی طاقت پر غرور کیا، جس نے انہیں سازش اور جرم کی طرف مائل کیا۔ یہ رویہ بتاتا ہے کہ جب حسد دل میں جگہ بنالے تو وہ محض انفرادی نہیں رہتا بلکہ اجتماعی فساد کو جنم دیتا ہے۔ معارف القرآن کے مطابق "وَنَحْنُ عُصْبَةٌ" سے یہ سبق ملتا ہے کہ اجتماعی طاقت اگر عدل و خیر کے بجائے منفی سوچ میں استعمال ہو تو وہ خاندان و معاشرے کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار کرتی ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ الزام تراشی اور والدین کی محبت پر بدگمانی خاندانی سکون کو برباد کر دیتی ہے۔ لہٰذا قرآن حسد، جتھہ بندی اور بدگمانی سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ اجتماعیت اعتماد، عدل اور محبت پر قائم رہے۔[1]

ضیاء القرآن

اس آیت کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حسد اور والد کی محبت پر اعتراض دراصل اخلاقی کمزوری اور خاندانی بگاڑ کا سبب بنا۔ انہوں نے اپنی کثرت اور جتھہ بندی پر غرور کرتے ہوئے یہ گمان کیا کہ ہم چونکہ زیادہ ہیں اس لیے زیادہ محبوب ہونے چاہییں۔ اس سوچ نے انہیں اپنے نبی والد حضرت یعقوبؑ تک پر کھلی گمراہی کا الزام لگانے پر مجبور کر دیا۔ ضیاء القرآن وضاحت کرتا ہے کہ جب حسد اور بدگمانی دل میں جڑ پکڑ لیں تو وہ نہ صرف افراد کے اخلاق کو بگاڑتے ہیں بلکہ پورے خاندانی نظام کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ آیت اس بات کا تنبیہ ہے کہ اجتماعی طاقت اور اکثریت اگر عدل و محبت سے خالی ہو تو وہ فتنہ، انتشار اور سازش کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ حسد، جتھہ بندی اور الزام تراشی سے بچ کر عدل، محبت اور اعتماد کو قائم رکھا جائے۔[2]

تبیان القرآن

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حسد اور والد پر الزام لگانا دراصل ان کے دلوں کے بگاڑ اور اخلاقی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی کثرت اور طاقت پر گھمنڈ کیا اور یہ سمجھ لیا کہ والد کی محبت بھی ہماری تعداد اور قوت کے حساب سے ہونی چاہیے، حالانکہ

---

[1] معارف القرآن، ج۴، ص۳۵۴

[2] ضیاء القرآن، ج۳، ص۲۳۷

محبت کا تعلق اخلاص، پاکیزگی اور اخلاق سے ہے۔ اس غلط سوچ نے انہیں اپنے ہی والد حضرت یعقوبؑ پر کھلی گمراہی کا الزام لگانے پر مجبور کر دیا، جو ایک سنگین جرم اور ناشکری کا رویہ ہے۔ تبیان القرآن وضاحت کرتا ہے کہ جب حسد اور بدگمانی دل میں جگہ بنالیں تو یہ صرف فرد کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ پورے خاندان کے امن و سکون کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اس آیت میں سبق دیا گیا ہے کہ اجتماعی طاقت کا استعمال حسد اور سازش کے لیے نہیں بلکہ محبت، عدل اور خیر خواہی کے لیے ہونا چاہیے۔[1]

سازش اور جھوٹ پر مبنی منصوبہ بندی

قولہ تعالی: ﴿اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ﴾[2]

"یوسف کو قتل کر دو یا اُسے کسی دور جگہ پھینک دو تا کہ تمہارے والد کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے، اور اس کے بعد تم نیک بن جانا۔"

یہ آیت اس خطرناک سوچ کو ظاہر کرتی ہے جو حسد اور خود غرضی سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد کی محبت کو حاصل کرنے کے لیے ایک نہایت سنگین سازش تیار کی، جس میں قتل یا جلاوطنی جیسے اقدامات شامل تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کو ہٹا کر والد کی محبت صرف خود تک محدود کر لیں۔ اس عمل میں نہ صرف ایک بے گناہ کی جان کو خطرے میں ڈالنے کا ارادہ تھا بلکہ پورے خاندانی نظام کو تباہ کرنے کی نیت بھی جھلکتی ہے۔ یہ سوچ کہ پہلے گناہ کر لو اور بعد میں نیک بن جانا، انسانی ضمیر کی گمراہی کو ظاہر کرتی ہے۔ ایسی سازشی ذہنیت معاشروں میں باہمی اعتماد کو کمزور کرتی ہے، بھائی چارہ، محبت اور خاندانی رشتے متاثر ہوتے ہیں، اور ایک ایسا ماحول پیدا ہوتا ہے جہاں ذاتی فائدہ ہی سب کچھ بن جاتا ہے۔ اگر ایسے رجحانات کو روکا نہ جائے تو خاندان بکھر جاتے ہیں، اور معاشرہ اخلاقی طور پر زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ یہ آیت ہمیں اس بات کی تنبیہ کرتی ہے کہ اجتماعی بھلائی، سچائی اور عدل و محبت کے بغیر ممکن نہیں۔

معارف القرآن

اس آیت کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے حسد اور خود غرضی کی بنیاد پر یہ سازش تیار کی کہ یا تو انہیں قتل کر دیا جائے یا دور پھینک دیا جائے تا کہ والد کی محبت صرف انہی کے لیے ہو جائے۔ یہ سوچ دراصل اخلاقی پستی اور شیطانی وسوسے کی نمائندگی کرتی ہے، کیونکہ انہوں نے گناہ کو وقتی فائدے کے لیے اختیار کیا اور بعد میں نیک بننے کا جھوٹا عزم کیا۔ معارف القرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہ طرزِ فکر انسان کو گناہ پر جری بناتی ہے اور ضمیر کو مفلوج کر دیتی ہے۔ قرآن نے اس واقعے کو مثال بنا کر سمجھایا کہ سازش اور جھوٹ پر مبنی منصوبہ بندی خاندان کو توڑ دیتی ہے اور معاشرے کے اعتماد کو برباد کر دیتی ہے۔[3]

ضیاء القرآن

اس آیت کی تشریح یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے والد کی محبت کو اپنی کثرت اور طاقت کے باوجود اپنی طرف مائل نہ دیکھ کر حسد میں آ کر ایک انتہائی سنگین سازش کی۔ انہوں نے کہا کہ یوسف کو قتل کر دو یا دور پھینک دو تا کہ باپ کی توجہ صرف ہماری طرف ہو جائے۔

---

[1] تبیان القرآن، ج۴، ص۳۳۵

[2] یوسف ۹:۱۲

[3] معارف القرآن، ج۴، ص۳۵۶

ضیاء القرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہ سوچ صرف بھائیوں کے دلوں کا بگاڑ ہی نہیں بلکہ خاندانی نظام کے لیے زہر قاتل ہے، کیونکہ انہوں نے باہمی رشتوں اور والد کی محبت کو ختم کرنے کے لیے جھوٹ اور جرم پر مبنی منصوبہ بنایا۔ مزید یہ کہ بعد میں نیک بننے کا ارادہ ان کی اخلاقی گمراہی اور خود فریبی کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن نے اسے تنبیہ کے طور پر بیان کیا ہے کہ سازش اور جھوٹ اگر رشتوں میں داخل ہو جائیں تو پورے معاشرے کو بگاڑ دیتے ہیں۔[1]

تبیان القرآن

اس آیت کی تشریح یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے والد کی محبت میں کمی کے وہم اور حسد کی وجہ سے انتہائی سنگین فیصلہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ یوسف کو قتل کر دو یا دور پھینک دو تاکہ والد کی توجہ صرف ہماری طرف ہو جائے۔ یہ سوچ دراصل ایمان اور اخلاق کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے، کیونکہ انہوں نے وقتی فائدے کے لیے بڑے گناہ کا ارادہ کیا اور ساتھ ہی یہ خود فریبی اختیار کی کہ "بعد میں ہم نیک ہو جائیں گے۔" تبیان القرآن وضاحت کرتا ہے کہ یہ طرزِ فکر ہر دور میں معاشرتی بگاڑ کی بنیاد ہے، جہاں لوگ وقتی مفاد کے لیے جرم کرتے ہیں اور پھر اصلاح کے دعوے کرتے ہیں۔ قرآن ہمیں یہ تنبیہ کرتا ہے کہ معصیت اور جھوٹ پر مبنی منصوبہ بندی کبھی بھی خیر و فلاح نہیں لا سکتی۔[2]

بے جا الزام تراشی

قولہ تعالی: ﴿وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾[3]

"اور شہر کی عورتیں کہنے لگیں: عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اس کے نفس سے بہکانے کی کوشش کر رہی ہے، وہ تو اس کی محبت میں دیوانی ہو گئی ہے۔ ہم تو اسے صریح گمراہی میں دیکھتے ہیں۔"

اس آیت میں ایک نہایت اہم معاشرتی بیماری کی نشاندہی کی گئی ہے جو کہ بے جا الزام تراشی، چغلی، اور معاشرتی کردار کشی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اس وقت منظر عام پر آیا جب شہر کی عورتوں میں باتیں ہونے لگیں کہ عزیز مصر کی بیوی نے اپنے ہی خادم کو فتنہ میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات انہوں نے نہ تحقیق سے کہی، نہ کسی ثبوت کے ساتھ، بلکہ صرف سنی سنائی بات کو بنیاد بنا کر ایک کردار پر تبصرہ کیا، جو کہ معاشرتی سطح پر بدگمانی، فتنہ انگیزی اور بدظنی کو جنم دیتا ہے۔

اس آیت میں صرف حضرت یوسفؑ کی پاکیزہ شخصیت پر تہمت کا پہلو ہی نہیں، بلکہ اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ افراد جب کسی معاشرتی یا نجی معاملے کو زبان پر لاتے ہیں تو وہ دراصل پورے معاشرے کی سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عورتوں کی یہ گفتگو نہ صرف ایک فرد کے کردار پر اثر ڈال رہی تھی بلکہ عزیز مصر کے خاندان کی عزت، معاشرتی مقام، اور عورت کی حرمت سبھی چیزیں زیر بحث آ گئیں۔ اسی طرح کی افواہیں اور الزام تراشی اکثر معاشرے میں بڑے بگاڑ اور غلط فہمیوں کا سبب بنتی ہیں۔

---

[1] ضیاء القرآن، ج۳، ص۲۳۸

[2] تبیان القرآن، ج۴، ص۳۹۵

[3] یوسف ۱۲:۳۰

یہ ایک نفسیاتی اور معاشرتی حقیقت ہے کہ جب لوگ کسی کی ذاتی زندگی پر زبان درازی کرتے ہیں تو وہ نہ صرف اُس فرد کو ذہنی اذیت پہنچاتے ہیں بلکہ سماج میں بدگمانی، حسد، اور عدمِ اعتماد کی فضا قائم کرتے ہیں۔ بے بنیاد باتیں پھیلانا اور کردار پر کیچڑ اچھالنا، خصوصاً کسی کے اخلاق و عفت پر، معاشرتی تانے بانے کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ایسے رجحانات خاندانوں کو بکھیر دیتے ہیں، معاشرتی رشتوں کو خراب کرتے ہیں، اور انسانیت کے شفاف تعلقات کو داغدار کرتے ہیں۔ اس آیت کے ذریعے ہمیں ایک بہت بڑی معاشرتی تنبیہ دی گئی ہے کہ ہم کسی کے بارے میں بات کرنے سے پہلے تحقیق کریں، خاص طور پر جب معاملہ کردار اور عزت کا ہو۔ بے جا الزام تراشی صرف ایک شخص کی شہرت کو نہیں بگاڑتی بلکہ پورے معاشرے میں بداعتمادی، منافقت، اور عدمِ تحفظ کے جذبات کو جنم دیتی ہے۔ آج کے دور میں جب سوشل میڈیا اور عام مجالس میں غیر ذمہ دارانہ گفتگو عام ہو گئی ہے، تو اس قرآنی رہنمائی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ عورتوں نے اپنے آپ کو نیکی کی علامت اور عزیز کی بیوی کو برائی کی علامت قرار دیا، حالانکہ وہ خود بعد میں اپنے عمل سے ثابت کرتی ہیں کہ وہ بھی اسی راہ پر چلنے والی تھیں۔ اس سے ایک اور اجتماعی خامی اجاگر ہوتی ہے، یعنی لوگوں کا دوسروں کو برا کہنا جبکہ خود وہ اسی طرح کی برائیوں میں ملوث ہوں۔ اس طرح کا منافقت پر مبنی معاشرتی رویہ افراد کی شخصیت پر منفی اثر ڈالتا ہے، اور اجتماعی اعتماد کو ختم کرتا ہے۔ آخر میں، یہ آیت ہمیں سچائی، تحقیق، اور زبان کی حفاظت کی تعلیم دیتی ہے۔ کسی کی عزت و حرمت کے بارے میں بات کرنے سے پہلے تحقیق اور حکمت لازم ہے۔ بصورتِ دیگر، معاشرے میں انارکی، فتنہ، اور تعلقات کی بربادی جنم لیتی ہے۔ قرآن ہمیں ان رویوں سے بچنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ معاشرہ امن، اخوت، عزت اور باہمی اعتماد پر قائم رہے۔

معارف القرآن

اس آیت میں حضرت یوسفؑ پر لگائے گئے الزام اور شہر کی عورتوں کی چغل خوری کو بیان کیا گیا ہے۔ معارف القرآن وضاحت کرتا ہے کہ عورتوں نے بغیر تحقیق کے سنی سنائی بات پر یوسف علیہ السلام اور عزیز کی بیوی پر گفتگو شروع کی، جو دراصل معاشرتی برائی یعنی "بے جا الزام تراشی" اور "کردار کشی" کی مثال ہے۔ یہ رویہ معاشرے میں بدگمانی اور فتنے کو جنم دیتا ہے اور عزت و حرمت کو مجروح کرتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی پاکدامنی کے باوجود ان کے بارے میں ایسی باتیں کرنا ثابت کرتا ہے کہ جب حسد یا تجسس غالب آ جائے تو لوگ اپنی زبان قابو میں نہیں رکھتے۔ معارف القرآن بتاتا ہے کہ قرآن یہاں ہمیں تنبیہ کرتا ہے کہ تحقیق کے بغیر کسی کی عزت پر حملہ نہ کیا جائے، ورنہ پورا معاشرتی اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔[1]

ضیاء القرآن

اس آیت میں ضیاء القرآن وضاحت کرتا ہے کہ عزیز کی بیوی کے بارے میں شہر کی عورتوں کی گفتگو دراصل معاشرتی عادت کو ظاہر کرتی ہے کہ لوگ دوسروں کے معاملات میں تجسس اور الزام تراشی کے ذریعے اپنی زبان کو مشغول رکھتے ہیں۔ انہوں نے حضرت یوسفؑ کی پاکیزگی کو نظر انداز کر کے صرف سنی سنائی بات پر تبصرہ کیا اور عورت کی عزت و عفت کو موضوعِ گفتگو بنا دیا۔ ضیاء القرآن بتاتا ہے کہ یہ رویہ

[1] معارف القرآن، ج ۴، ص ۲۳۷

محض فرد کو نقصان نہیں دیتا بلکہ پورے خاندانی اور سماجی نظام میں بد اعتمادی اور فتنے کو پھیلاتا ہے۔ قرآن کریم اس طرزِ عمل کو سختی سے رد کرتا ہے اور ہمیں سچائی، احتیاط اور زبان کی حفاظت کی تعلیم دیتا ہے۔[1]

تبیان القرآن

آیت کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے کہ عزیز کی بیوی کے بارے میں شہر کی عورتوں کی گفتگو دراصل معاشرتی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے کہ لوگ دوسروں کی نجی زندگی کو اپنی محفلوں کا موضوع بنالیتے ہیں۔ انہوں نے نہ حقیقت کی تحقیق کی اور نہ ہی معاملے کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ حضرت یوسفؑ اور عزیز کی بیوی دونوں کے کردار پر گفتگو شروع کر دی۔ یہ طرزِ عمل اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ الزام تراشی اور چغلی صرف ایک فرد کی عزت کو متاثر نہیں کرتی بلکہ پورے معاشرے کی اخلاقی فضا کو آلودہ کر دیتی ہے۔ تبیان القرآن اس آیت سے یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو زبان کی حفاظت کرنی چاہیے اور بلا تحقیق کسی کی عزت و حرمت کے بارے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔[2]

معاشرتی مسائل

جھوٹ اور دھوکہ دہی

قولہ تعالی: ﴿وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ وَجَاءُوا عَلَىٰ قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ﴾[3]

"اور وہ (یوسف کے بھائی) اپنے باپ کے پاس شام کو روتے ہوئے آئے، اور یوسف کا قمیص جھوٹے خون کے ساتھ لے آئے۔"

یہ آیات ایک نہایت اہم معاشرتی برائی یعنی جھوٹ اور دھوکہ دہی کو نمایاں کرتی ہیں، جو نہ صرف فرد کی شخصیت بلکہ پورے معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حسد کی بنیاد پر نہ صرف اپنے سگے بھائی کو کنویں میں ڈال کر ظالمانہ اقدام کیا، بلکہ اس پر جھوٹ کا لبادہ اوڑھ کر اپنے والد کو دھوکہ دینے کی منصوبہ بندی بھی کی۔ قمیص پر جھوٹا خون لگا کر وہ روتے ہوئے گھر لوٹے تاکہ اپنے گناہ کو چھپا سکیں اور خود کو بے گناہ ظاہر کر سکیں۔

یہ واقعہ اس بات کی علامت ہے کہ جب جھوٹ اجتماعی طور پر بولا جائے اور دھوکہ دہی کو مشترکہ عمل بنالیا جائے تو وہ نہ صرف ایک انفرادی گناہ رہتا ہے بلکہ پورے خاندان، رشتوں اور معاشرتی نظام کو کمزور کر دیتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، جو ایک نبی تھے، ان کی بصیرت نے بھانپ لیا کہ یہ جھوٹ ہے، مگر اولاد کے جھوٹ اور فریب پر جو دکھ اور اذیت انہیں پہنچی، وہ انسانی جذبات کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ آج بھی یہی جھوٹ اور دھوکہ کئی خاندانوں کو بکھیر رہا ہے، اور معاشرتی اقدار کو کھوکھلا کر رہا ہے۔

جھوٹ صرف زبان سے نکلے الفاظ نہیں ہوتے بلکہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو رشتوں میں عدم اعتماد، شکوک، دوری اور دل شکنی کو جنم دیتا ہے۔ حضرت یوسف کے بھائیوں کا جھوٹ وقتی طور پر شاید انہیں مطمئن کر گیا ہو، مگر وقت نے انہیں ان کے عمل کا احساس دلا دیا۔ اس

---

[1] ضیاء القرآن، ج۳، ص۴۹۱

[2] تبیان القرآن، ج۴، ص۳۴۵

[3] یوسف ۱۸:۱۲

جھوٹ کا نتیجہ صرف حضرت یوسفؑ کی جدائی تک محدود نہ رہا بلکہ حضرت یعقوبؑ کی بینائی کی محرومی، اور برسوں کی جدائی کی صورت میں سامنے آیا۔

معاشرے میں جب جھوٹ اور فریب کو معمول بنا لیا جائے تو وہاں عدل، دیانت، اور سچائی جیسی اقدار ناپید ہو جاتی ہیں۔ ایسے معاشرے میں نہ انصاف قائم رہتا ہے، نہ رشتے محفوظ ہوتے ہیں، نہ ہی لوگ ایک دوسرے پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ افراد وقتی فائدے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں لیکن یہی جھوٹ اجتماعی طور پر معاشرتی بگاڑ، بداعتمادی، اور انتشار کو جنم دیتا ہے۔ ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ جھوٹ بولنے والے افراد اکثر اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے جذباتی طریقے اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ یوسف کے بھائیوں نے کیا رونا، قمیص لانا، اور ظاہری درد دکھانا۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ ظاہری مظلومیت ہمیشہ اصل مظلوم ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ سچ کی بنیاد صرف الفاظ یا آنسو نہیں بلکہ ایمانداری، دیانت اور حقیقت پسندی ہے۔

موجودہ دور میں بھی یہی مسئلہ شدت سے موجود ہے کہ بہت سے افراد دھوکہ، فریب، اور جھوٹ کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، چاہے اس کی قیمت کسی کی عزت، خوشی یا خاندان کیوں نہ ہو۔ اداروں میں بدعنوانی، رشتوں میں دھوکہ، اور کاروبار میں بے ایمانی جیسے جرائم اسی جھوٹ کے پھیلاؤ کی شکلیں ہیں۔ قرآن ہمیں یوسف علیہ السلام کی سیرت سے یہ سکھاتا ہے کہ سچائی کے راستے پر ثابت قدمی اور جھوٹ سے اجتناب، ہی فرد اور معاشرے کی بھلائی کی ضمانت ہے۔

معارف القرآن

اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا جھوٹ اور دھوکہ دراصل اس اخلاقی کمزوری کا مظہر تھا جو حسد سے پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے والد کو قمیص پر جھوٹا خون لگا کر رلانے کی کوشش کی تاکہ جرم چھپ سکے، مگر جھوٹ کے باوجود حقیقت پر پردہ نہ پڑ سکا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ وقتی فائدہ تو دے سکتا ہے مگر آخرکار انسان کو رسوا کر دیتا ہے۔ معارف القرآن کے مطابق یہ واقعہ اس بات کا درس دیتا ہے کہ جھوٹ اور فریب خاندانوں کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار کرتے ہیں اور والدین کے دلوں کو شدید صدمہ پہنچاتے ہیں۔ اسی لیے قرآن جھوٹ کو صرف ایک فرد کا گناہ نہیں بلکہ معاشرتی بگاڑ کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔[1]

ضیاء القرآن

آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حسد اور بغض میں آکر ایسا بڑا جھوٹ گھڑا کہ اپنے ہی سگے بھائی کے خون کا ڈرامہ رچایا۔ انہوں نے قمیص پر جھوٹا خون لگا کر والد کو دھوکہ دینے کی کوشش کی، مگر یعقوب علیہ السلام نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ جھوٹ ہے۔ ضیاء القرآن وضاحت کرتا ہے کہ جھوٹ انسان کو وقتی طور پر مطمئن تو کر دیتا ہے لیکن اس کے اثرات نہ صرف رشتوں کو توڑتے ہیں بلکہ

[1] معارف القرآن، ج۵، ص۴۳۵

والدین کے دل کو بھی زخمی کر دیتے ہیں۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جھوٹ ایک ایسا زہر ہے جو خاندان کے سکون اور اعتماد کو برباد کر دیتا ہے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کے ذریعے یہ سبق دیا ہے کہ سچائی ہی امن، محبت اور اعتماد کی بنیاد ہے جبکہ جھوٹ ہمیشہ رسوائی اور نقصان کا سبب بنتا ہے۔[1]

تبیان القرآن

اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حسد کی آگ میں اندھے ہو کر جھوٹ اور فریب کا راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے والد حضرت یعقوبؑ کو دھوکہ دینے کے لیے یوسفؑ کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر پیش کیا اور روتے ہوئے اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش کی۔ مگر نبی کی بصیرت نے ان کے فریب کو پہچان لیا۔ تبیان القرآن کے مطابق یہ واقعہ واضح کرتا ہے کہ جھوٹ وقتی سہارا تو بن سکتا ہے لیکن وہ کبھی دیرپا کامیابی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس، جھوٹ رشتوں میں بداعتمادی، دل شکنی اور معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔ قرآن اس کے ذریعے یہ تعلیم دیتا ہے کہ سچائی ہی فرد اور معاشرے کے سکون اور اعتماد کی بنیاد ہے۔[2]

عدالت اور انصاف کا فقدان

قولہ تعالی: ﴿ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ﴾[3]

"پھر ان لوگوں کو، باوجود یہ کہ وہ نشانیاں دیکھ چکے تھے، یہ مناسب معلوم ہوا کہ (یوسف کو) ایک مدت تک قید کر دیں۔"

یہ آیت ایک انتہائی اہم اجتماعی اور قانونی مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہے، یعنی معاشرے میں انصاف کا فقدان اور عدالتی فیصلوں میں دباؤ، سازش یا طاقتور طبقے کے مفاد کو ترجیح دینا۔ حضرت یوسفؑ پر الزام لگایا گیا، جب کہ حقائق واضح طور پر ان کی پاکدامنی اور برأت کی گواہی دے رہے تھے۔ عورتوں کے ہاتھ کاٹنے والا واقعہ، ان کے کردار کی عظمت کا اقرار، اور خود عزیزِ مصر کی بیوی کا اعتراف—سب کچھ حق اور سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ مگر اس کے باوجود انہیں قید کر دینا، اس بات کا ثبوت ہے کہ فیصلہ عدل و قانون کی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاست، مصلحت اور طاقتور طبقے کے دباؤ پر کیا گیا۔

یہ صورتحال ہر اس معاشرے کے لیے لمحہ فکریہ ہے جہاں انصاف کا معیار طاقت، رتبہ، یا مفاد پرستی کی بنیاد پر طے ہوتا ہے۔ جب کسی بے گناہ کو صرف اس لیے قید کر دیا جائے کہ سچائی کا اعتراف بااثر افراد کے لیے باعث شرمندگی بن جائے، تو یہ عدل و انصاف کی توہین ہے اور پورے معاشرے کی بنیادوں کو کمزور کر دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کا جیل جانا نہ صرف فرد پر ظلم تھا بلکہ ایک مثالی معاشرتی اور قانونی رویہ کی ناکامی بھی تھی۔ اس قسم کی ناانصافی سے معاشرے میں بداعتمادی، مایوسی، اور محرومی جنم لیتی ہے۔ لوگ قانون سے امید کھو دیتے ہیں اور وہ راستے اختیار کرتے ہیں جو بغاوت یا خود انتقامی پر مبنی ہوتے ہیں۔

---

[1] ضیاء القرآن، پیر کرم شاہ الازہری، ج۳، ص۲۵۹

[2] تبیان القرآن، ج۵، ص۴۲۶

[3] یوسف ۱۲:۳۵

یہ آیت یہ بھی واضح کرتی ہے کہ بعض اوقات حقیقت جاننے کے باوجود ظالم طبقہ سچ کو دبانے اور اپنی عزت و اقتدار کی خاطر ناحق فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اگرچہ حضرت یوسفؑ کا قید میں جانا ان کے لیے اللہ کی طرف سے آزمائش اور تربیت کا ذریعہ تھا، لیکن انسانی سطح پر یہ ایک عدالتی ناکامی اور سماجی بے انصافی کی علامت ہے۔ موجودہ دور میں بھی عدل و انصاف کے نظام میں اسی قسم کے بگاڑ دیکھنے کو ملتے ہیں: غریب اور بے وسیلہ لوگ سالہا سال قید میں پڑے رہتے ہیں، جبکہ بااثر مجرم آزاد پھرتے ہیں۔ جب عدالتیں حقائق کے بجائے اثر و رسوخ یا سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر فیصلے کریں، تو ظلم کو قانون کا لباس پہنا دیا جاتا ہے۔ یہ طرزِ عمل معاشرے کو تباہی کے دہانے پر لے آتا ہے۔

لہٰذا، سورہ یوسف کی یہ آیت نہ صرف ایک تاریخی واقعہ بیان کرتی ہے بلکہ ہر دور کے انسان اور معاشرے کے لیے ایک تنبیہ، رہنمائی اور اصولِ عدل کی یاد دہانی ہے کہ انصاف کو صرف قانون کی زبان سے نہیں بلکہ دیانت، تقویٰ اور خوفِ خدا کے ساتھ نافذ کیا جائے تاکہ معاشرہ پائیدار، پرامن اور محفوظ بن سکے۔

معارف القرآن

اس آیت کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی بے گناہی کے واضح دلائل موجود تھے، مگر اس کے باوجود انہیں قید کر دینا عدل و انصاف کی پامالی کی نشانی ہے۔ عورتوں کے ہاتھ کاٹنے کا واقعہ، خود عزیز کی بیوی کا اعتراف اور دیگر شواہد سب یوسفؑ کی براءت کے لیے کافی تھے، لیکن مصلحت اور دباؤ کی وجہ سے فیصلہ ان کے خلاف کیا گیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جب معاشرے میں طاقتور طبقے کے دباؤ پر فیصلے ہوں اور قانون کمزور کے خلاف استعمال ہو تو وہاں عدل ختم ہو جاتا ہے۔ معارف القرآن کے مطابق یہ آیت ہمیں خبردار کرتی ہے کہ انصاف کا معیار ہمیشہ حقائق اور تقویٰ پر ہونا چاہیے، ورنہ معاشرہ ظلم، بداعتمادی اور بگاڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔[1]

ضیاء القرآن

اس آیت کو عدل و انصاف کے فقدان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی بے گناہی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی، عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے، عزیزِ مصر کی بیوی نے اقرار کر لیا، مگر اس سب کے باوجود انہیں قید کر دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ فیصلہ عدل کی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی مصلحت اور معاشرتی دباؤ پر کیا گیا۔ ضیاء القرآن وضاحت کرتا ہے کہ جب حقائق کے باوجود سچ کو دبا دیا جائے تو یہ ظلم کو قانون کا لبادہ پہنانے کے مترادف ہے۔ اس سے معاشرے میں ناانصافی، بداعتمادی اور محرومی جنم لیتی ہے۔ یہ آیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ انصاف ہمیشہ حق و سچائی پر ہونا چاہیے، نہ کہ طاقت اور دباؤ کی بنیاد پر۔[2]

تبیان القرآن

اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی براءت ظاہر ہو چکی تھی، حتیٰ کہ عزیزِ مصر کی بیوی نے بھی ان کی پاکدامنی کا اعتراف کر لیا، مگر اس کے باوجود انہیں قید کر دینا عدل کے تقاضوں کی نفی تھی۔ یہ اقدام دراصل درباری سیاست، عزتِ نفس کے تحفظ اور معاشرتی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ تبیان القرآن کے مطابق یہ آیت بتاتی ہے کہ جب عدالت اور اقتدار حق کے بجائے مصلحتوں کو ترجیح دے تو

---

[1] معارف القرآن، ج۴، ص۴۴۵

[2] ضیاء القرآن، ج۳، ص۴۵۰

بے گناہ بھی مجرم قرار پاتا ہے۔ یہ رویہ معاشرے کو ظلم، بے اعتمادی اور بگاڑ کی طرف لے جاتا ہے۔ قرآن یہاں عدل و انصاف کی حقیقی بنیاد یاد دلاتا ہے کہ فیصلے صرف حق، تقویٰ اور خوفِ خدا کی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔[1]

معاشرتی بحران میں تدبیر

قولہ تعالیٰ: ﴿قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ﴾[2]

(یوسف نے کہا:) "تم سات سال مسلسل کھیتی باڑی کرتے رہو گے، پس جو کچھ تم کاٹو، اسے اس کی بالیوں میں ہی چھوڑ دینا، سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے جو تم کھاؤ۔"

یہ آیت حضرت یوسف علیہ السلام کے تدبر، دانشمندی اور دوراندیشی کی عملی مثال ہے۔ مصر کے بادشاہ نے جب خواب دیکھا اور اس کی تعبیر درکار ہوئی تو حضرت یوسفؑ نے صرف خواب کی تعبیر ہی نہیں بتائی، بلکہ اس کے ممکنہ معاشرتی بحران (قحط) کے لیے ایک جامع تدبیر اور حکمت عملی بھی پیش کی۔ یہ آیت ہمیں سکھاتی ہے کہ جب معاشرے کو کسی بڑے چیلنج یا بحران کا سامنا ہو، جیسے کہ قحط، وبا، یا اقتصادی بحران، تو فوری ردعمل کے بجائے منصوبہ بندی، ذخیرہ اندوزی (حلال طریقے سے)، اور وسائل کی دانشمندانہ تقسیم انتہائی ضروری ہے۔ حضرت یوسفؑ نے حکم دیا کہ کھیتی باڑی کا سلسلہ جاری رکھا جائے اور جو فصل حاصل ہو، اسے اس کی بالیوں سمیت محفوظ رکھا جائے تاکہ اناج کو طویل مدت تک خراب ہونے سے بچایا جاسکے۔ یہ ایک سائنسی اور معاشی تدبیر بھی ہے اور عملی حکمت کی بہترین مثال بھی۔

حضرت یوسفؑ کی تدبیر کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے کمیونٹی کی سطح پر سوچا۔ انہوں نے ذاتی یا انفرادی نجات کے بجائے ایک پوری قوم کی فلاح وبقا کو مدنظر رکھا۔ آج کے دور میں جب انسان اکثر صرف اپنے فائدے کی فکر کرتا ہے، یہ قرآنی واقعہ ہمیں اجتماعی فلاح کا درس دیتا ہے کہ معاشرتی بحرانوں سے نجات کے لیے قومی سطح پر حکمت عملی، وسائل کی منصفانہ تقسیم، اور قیادت کی ایمانداری لازم ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صرف دعا اور تقدیر پر بھروسہ کافی نہیں، بلکہ عقل، عمل، اور تدبیر کو بھی اختیار کرنا ضروری ہے۔ حضرت یوسفؑ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین معاشی مشیر بھی تھے، اور انہوں نے مستقبل کے ممکنہ خطرے کو نظرانداز کرنے کے بجائے اس کا پیشگی حل تجویز کیا۔

موجودہ دور میں جب کئی ممالک اور معاشرے ماحولیاتی تبدیلی، خوراک کی قلت، معاشی بدحالی، اور آفات جیسے بحرانوں سے دوچار ہیں، اس آیت سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ ہمیں بھی دوراندیشی، منصوبہ بندی اور مشترکہ کوشش کے ذریعے ایسے حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ خواہ معاملہ سرکاری پالیسی کا ہو، ادارہ جاتی اصلاحات کا، یا فرد کی سطح پر وسائل کے استعمال کا، حضرت یوسفؑ کا ماڈل ہر سطح پر قابل عمل اور مؤثر ہے۔ نتیجتاً، سورہ یوسف کی یہ آیت ایک کامیاب قومی بحران مینجمنٹ ماڈل فراہم کرتی ہے، جو ہمیں سکھاتی ہے کہ پریشانی کے وقت خوف یا بے عملی کے بجائے علم، منصوبہ بندی اور قربانی کا راستہ اختیار کرکے نہ صرف خود کو بلکہ پورے معاشرے کو بچایا جاسکتا ہے۔

---

[1] تبیان القرآن، ج۴، ص۱۶۵

[2] یوسف ۱۲:۴۷

معارف القرآن

اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے صرف خواب کی تعبیر نہیں دی بلکہ اس کے مطابق ایک عملی معاشی تدبیر بھی بتائی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندے صرف دینی رہنمائی ہی نہیں کرتے بلکہ معاشرتی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لیے بھی بہترین حکمت عملی فراہم کرتے ہیں۔ یوسفؑ نے زراعت کو جاری رکھنے، اناج کو بالیوں سمیت ذخیرہ کرنے اور کم سے کم خرچ کرنے کی ہدایت کی تاکہ قحط کے ایام میں پوری قوم محفوظ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بڑے بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تدبیر، منصوبہ بندی اور اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن یہ سبق دیتا ہے کہ دعا اور توکل کے ساتھ ساتھ عملی تدابیر اختیار کرنا بھی ایمان کا حصہ ہے۔[1]

ضیاء القرآن

اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ پیر محمد کرمانی لکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے ساتھ ہی ایک بہترین معاشی لائحہ عمل بھی دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو ایسی حکمت عطا فرماتا ہے جو صرف دینی رہنمائی تک محدود نہیں بلکہ دنیاوی فلاح کے لیے بھی کارآمد ہو۔ یوسفؑ نے ہدایت دی کہ سات سال کی کھیتی کو بالیوں سمیت ذخیرہ کیا جائے تاکہ دانہ زیادہ عرصے تک محفوظ رہے اور قحط کے زمانے میں قوم کی ضرورت پوری ہو سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معاشرتی بحران کے وقت عقل، تدبیر اور دوراندیشی اختیار کرنا سنتِ انبیاء ہے۔ قرآن کا یہ اسلوب انسان کو سکھاتا ہے کہ دعا اور اللہ پر بھروسے کے ساتھ ساتھ اسباب اختیار کرنا بھی لازمی ہے۔[2]

تبیان القرآن

علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے خواب کی تعبیر کے ساتھ مصر کے لوگوں کے لیے ایک جامع حکمت عملی بھی پیش کی۔ انہوں نے سات سال کی بھرپور فصل کو ذخیرہ کرنے کا حکم دیا تاکہ آئندہ قحط کے سالوں میں لوگوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ یہ تدبیر صرف ذاتی فائدے کے لیے نہیں بلکہ پوری قوم کی فلاح اور بقا کے لیے تھی۔ اس آیت سے سیکھا جاتا ہے کہ معاشرتی یا قومی بحران کے وقت عقل، منصوبہ بندی اور اجتماعی عمل کو ترجیح دینا ضروری ہے۔ حضرت یوسفؑ کی مثال یہ بھی بتاتی ہے کہ نبی کی رہنمائی میں عملی اور دینی حکمت دونوں شامل ہوتی ہیں۔ یہ سبق آج کے دور میں بحران مینجمنٹ اور وسائل کی دانشمندانہ تقسیم کے لیے بھی قابلِ عمل ہے۔[3]

اخلاقی مسائل

معافی اور درگزر کا رویہ

قولہ تعالیٰ: ﴿قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾[4]

یوسف نے کہا: "آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

---

[1] معارف القرآن، ج۴، ص۳۷۵

[2] ضیاء القرآن، ج۳، ص۴۹۷

[3] تبیان القرآن، ج۴، ص۳۶۲

[4] یوسف ۱۲:۹۲

یہ آیت معافی، عفو، اور بلند اخلاق کی عظیم مثال ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بچپن میں جن بھائیوں نے حسد کی بنیاد پر کنویں میں پھینک کر قتل کرنے کی کوشش کی، جنہوں نے جھوٹ بولا، دھوکہ دیا اور اپنے والد کا دل دکھایا، آج وہی بھائی حضرت یوسفؑ کے سامنے عاجز اور شرمندہ کھڑے تھے۔ اس مقام پر، یوسفؑ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ان سے انتقام لیں یا کم از کم ان کے جرائم کا تذکرہ کر کے انہیں شرمندہ کریں۔ لیکن انہوں نے نہ صرف انہیں معاف کر دیا بلکہ فرمایا: "لاتثریب علیکم الیوم "یعنی "آج تم پر کوئی الزام نہیں"۔ یہ الفاظ نہ صرف معافی کا اعلان ہیں بلکہ ایک نئی محبت، تعلق، اور بھائی چارے کا آغاز بھی ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی شخصیت کا یہ پہلو ہمیں سکھاتا ہے کہ حقیقی عظمت بدلے میں بدلہ لینے میں نہیں، بلکہ درگزر، رحم، اور اصلاح کے جذبے میں ہے۔ ان کا یہ رویہ دشمنی کو مٹاتا ہے، قلوب کو جوڑتا ہے، اور خاندانوں کو دوبارہ یکجا کر دیتا ہے۔

معاشرتی سطح پر یہ پیغام انتہائی اہم ہے، خصوصاً ان معاشروں میں جہاں حسد، کینہ، انتقام، اور تعلقات کی دراڑیں عام ہوں۔ حضرت یوسفؑ کی یہ حکمت عملی سکھاتی ہے کہ اگر ایک فریق معاف کر کے اصلاح اور تعلقات کی بحالی کے لیے پہل کرے، تو وہ پورے معاشرے میں امن، رواداری، اور محبت کا ماحول پیدا کر سکتا ہے۔

یہ آیت نہ صرف انفرادی اخلاق کی عکاس ہے بلکہ اجتماعی و خاندانی یکجہتی کا بھی پیغام دیتی ہے۔ یوسفؑ کی معافی نے صرف بھائیوں کو نجات نہیں دی بلکہ حضرت یعقوبؑ کے بچھڑے ہوئے خاندان کو دوبارہ یکجا کر دیا، اور ایک بکھری ہوئی قوم کو عزت، اقتدار اور برکت کا ذریعہ بنایا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ معافی کا اثر صرف افراد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کے دوررس اجتماعی نتائج بھی ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ حضرت یوسفؑ نے صرف خود معاف نہیں کیا بلکہ اللہ کی مغفرت کی بھی دعا کی: "یغفر اللہ لکم "یعنی اللہ تمہیں معاف کرے۔ یہ دعا اس بات کی علامت ہے کہ ان کا دل واقعی صاف تھا اور وہ اصلاح چاہتے تھے، انتقام نہیں۔ موجودہ دور میں جب رشتے معمولی باتوں پر ٹوٹ جاتے ہیں، جب عداوتیں نسلوں تک منتقل ہوتی ہیں، جب معمولی جھگڑے بڑے فساد بن جاتے ہیں، سورہ یوسف کی یہ آیت رحم و درگزر، تحمل، اور اصلاح کی عظیم مثال ہے۔ اس سے سیکھا جا سکتا ہے کہ ہمیں نہ صرف دل بڑا رکھنا چاہیے بلکہ اپنے رویوں سے دوسروں کی اصلاح اور معاشرتی بہتری کے لیے بھی کردار ادا کرنا چاہیے۔

معارف القرآن

اس آیت کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے ظلم اور دھوکہ کے باوجود ان سے انتقام نہیں لیا بلکہ معافی اور درگزر کا اعلیٰ اخلاقی رویہ اپنایا۔ یہ عمل نہ صرف ذاتی بلندی بلکہ خاندانی اور اجتماعی یکجہتی کا سبب بنا۔ معافی سے دلوں میں محبت، اصلاح اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ یہ آیت معاشرتی سطح پر بھی امن، رواداری اور تعلقات کی بحالی کی تعلیم دیتی ہے۔ یوسفؑ نے اللہ سے مغفرت کی دعا بھی کی، جو دل کی پاکیزگی اور اصلاح کے جذبے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ حقیقی عظمت انتقام میں نہیں بلکہ رحم و درگزر میں ہے۔[1]

[1] معارف القرآن، ج۶، ص۳۴۵

ضیاءالقرآن

اس آیت کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کے ظلم اور دھوکہ کے باوجود انتقام نہیں لیا بلکہ معافی اور درگزر کا اعلیٰ اخلاق اپنایا۔ اس رویے نے نہ صرف ذاتی بلندی بلکہ خاندانی اور اجتماعی یکجہتی کو فروغ دیا۔ معافی سے محبت، اصلاح اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ یہ عمل معاشرتی سطح پر امن، رواداری اور تعلقات کی بحالی کی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اللہ سے مغفرت کی دعا بھی کی، جو دل کی پاکیزگی اور اصلاح کے جذبے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی سچائی، رحم و درگزر، اور اصلاح کی اعلیٰ مثال ہے۔[1]

تبیان القرآن

اس آیت کی تشریح میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کے ظلم اور زیادتی کے باوجود انتقام نہیں لیا بلکہ معافی اور عفو کا اعلیٰ رویہ اپنایا۔ اس عمل نے نہ صرف ذاتی اخلاقی بلندی بلکہ خاندانی اور اجتماعی یکجہتی کو بھی فروغ دیا۔ معافی سے محبت، اصلاح اور باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ یہ رویہ معاشرتی سطح پر امن، رواداری اور تعلقات کی بحالی کی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اللہ سے مغفرت کی دعا بھی کی، جو دل کی پاکیزگی اور اصلاح کے جذبے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی اخلاقی اصول فرد اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے نمونہ ہے۔[2]

احسان اور صبر کی اخلاقی تعلیم

قولہ تعالیٰ: ﴿إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾[3]

"بے شک جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر سے کام لے، تو یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

یہ آیت حضرت یوسفؑ کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ اور ان کے صبر و احسان کا ربانی اعتراف ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جن مراحل سے گزرے—بھائیوں کی سازش، کنویں میں ڈالے جانا، غلامی، بے جا الزام، قید و بند، اور تنہائی یہ سب ایسے واقعات تھے جو کسی بھی فرد کو توڑ سکتے تھے، لیکن حضرت یوسفؑ نے ہر موقع پر تقویٰ یعنی خدا خوفی اور صبر کو اپنایا، یہ آیت دو عظیم اخلاقی اقدار: تقویٰ (اللہ سے ڈرنا اور گناہوں سے بچنا) اور صبر (برداشت، ثابت قدمی) کو معاشرتی و انفرادی اخلاقی کامیابی کی بنیاد قرار دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو ان دونوں کو اختیار کرے گا، وہ "محسن" یعنی نیکی کرنے والوں کے زمرے میں آتا ہے، اور اللہ ان کے اجر کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ یہ تعلیم فرد کو اعتماد دیتی ہے کہ دنیا کی ناانصافیوں، آزمائشوں، اور سازشوں کے باوجود اگر وہ حق پر قائم رہے، صبر کرے، اور احسان کا دامن نہ چھوڑے تو اس کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔

معاشرتی اعتبار سے یہ پیغام نہایت اہم ہے۔ اکثر افراد نیکی کے راستے پر چلنے کے باوجود مایوس ہو جاتے ہیں جب انہیں فوری انصاف یا بدلہ نہیں ملتا، لیکن یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر سے کوئی عمل پوشیدہ نہیں، اور اخلاقی استقامت کا صلہ ضرور دیا جاتا ہے۔ یوسف علیہ

---

[1] ضیاءالقرآن، ج۳، ص ۴۱۲

[2] تبیان القرآن، ج ۳، ص ۴۱۲

[3] یوسف ۱۲:۹۰

السلام کی مثال ہمارے سامنے ہے، جو غلامی سے اُٹھ کر مصر کے بادشاہی نظام کا حصہ بنے اور ہزاروں لوگوں کی زندگیوں کے نگران بنے۔ احسان اور صبر صرف ذاتی صفات نہیں بلکہ یہ معاشرے میں عدل، برداشت، اور خیر خواہی کو فروغ دینے والے عناصر ہیں۔ جو شخص اللہ سے ڈر کر دوسروں سے بھلائی کرتا ہے، وہ فساد نہیں پھیلنے دیتا، بدلہ لینے کی بجائے اصلاح کا راستہ اختیار کرتا ہے، اور معاشرتی امن و سلامتی کا ضامن بن جاتا ہے۔

یہ آیت افراد کو یاد دلاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ظاہری کامیابیوں کو نہیں دیکھتا بلکہ نیت، کوشش، اور کردار کو بھی وزن دیتا ہے۔ صبر کرنے والا شخص وقتی طور پر نظر انداز ہو سکتا ہے، لیکن اللہ کے ہاں اس کی قدر و منزلت ہمیشہ بلند رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کا ذکر آج تک مثالی کردار کے طور پر کیا جاتا ہے۔

سورہ یوسف کی یہ آیت بتاتی ہے کہ جو لوگ ظلم سہہ کر بھی تقویٰ اور صبر کے دامن کو نہیں چھوڑتے، وہی درحقیقت اللہ کے محبوب بندے ہیں، اور وہی معاشرے کو بہتر بنانے والے حقیقی محسن ہوتے ہیں۔ ایسے افراد نہ صرف اپنی ذات کو اخلاقی بلندی تک پہنچاتے ہیں بلکہ معاشرے کو بھی امن، تحمل، اور خیر کی طرف لے کر جاتے ہیں۔

معارف القرآن

اس آیت کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر اور تقویٰ کو اپنا شعار بنایا، جس نے انہیں ظالم بھائیوں، جھوٹے الزامات، غلامی اور قید جیسے حالات میں ثابت قدم رکھا۔ یہ آیت احسان اور صبر کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور سکھاتی ہے کہ نیکی کرنے والوں کا اجر اللہ ضائع نہیں کرتا۔ صبر اور تقویٰ نہ صرف ذاتی اخلاقی بلندی کا باعث ہیں بلکہ معاشرتی امن، عدل اور خیر خواہی کو فروغ دیتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ کی مثال ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ نیک اعمال اور صبر کے ساتھ اخلاقی استقامت انسان کو دنیا و آخرت میں کامیاب بناتی ہے۔ یہ آیت فرد کو حوصلہ دیتی ہے کہ ظلم و ناانصافی کے باوجود صبر اور احسان کے راستے پر قائم رہیں۔ معاشرتی طور پر صبر و تقویٰ ایسے افراد پیدا کرتے ہیں جو سماجی اصلاح، تعلقات کی بحالی اور امن و محبت کے ضامن ہوتے ہیں۔[1]

ضیاء القرآن

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی صبر، تقویٰ اور احسان کی عملی مثال ہے۔ انہوں نے بھائیوں کی سازش، جھوٹے الزامات، غلامی اور قید کے باوجود صبر اور اللہ خوفی کو اختیار کیا۔ آیت بتاتی ہے کہ جو شخص نیکی کرے اور صبر کرے، اللہ تعالیٰ اس کے اعمال ضائع نہیں کرتا۔ یہ اخلاقی اصول فرد کی ذاتی بلندی کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح، عدل و انصاف اور محبت و اخوت کو فروغ دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی مثال یہ درس دیتی ہے کہ ظلم و ناانصافی کے باوجود صبر اور احسان کا دامن چھوڑنا حقیقی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اسی طرح معاشرتی سطح پر صبر و تقویٰ رکھنے والے افراد معاشرے میں امن، اعتماد اور اصلاح کے لیے مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔[2]

---

[1] معارف القرآن، ج ۴، ص ۴۲۱

[2] ضیاء القرآن، ج ۳، ص ۳۹۸

تبیان القرآن

حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی سازش، قید، اور جھوٹے الزامات کے باوجود صبر اور تقویٰ کو اپنایا۔ آیت یہ درس دیتی ہے کہ جو شخص نیکی کرے اور صبر سے کام لے، اللہ تعالیٰ اس کے اعمال ضائع نہیں کرتا۔ یہ اصول نہ صرف فرد کی اخلاقی بلندی کے لیے ضروری ہے بلکہ معاشرتی اصلاح، عدل، اور بھائی چارے کے فروغ کا بھی باعث بنتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی زندگی یہ واضح کرتی ہے کہ صبر اور احسان کے ساتھ برتاؤ انسان کو حقیقی کامیابی اور اللہ کی قربت عطا کرتا ہے۔ ایسے افراد معاشرے میں امن، اعتماد اور اصلاح کی مثال قائم کرتے ہیں۔ اس طرح، تقویٰ اور صبر نہ صرف ذاتی بلکہ اجتماعی بھلائی کے لیے بھی لازم ہیں۔[1]

امانت اور دیانت کا تقاضا

قولہ تعالیٰ: ﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾[2]

یوسفؑ نے کہا: مجھے سرزمین کے خزانے (ذخیرہ گاہوں) پر مقرر کر دیجیے، یقیناً میں حفاظت کرنے والا اور علم رکھنے والا ہوں۔

یہ آیت ایک صالح، باصلاحیت اور باکردار فرد کی طرف سے اقتدار و انتظام کی ذمہ داری لینے کی اخلاقی و شرعی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ قول اس وقت سامنے آیا جب مصر کے بادشاہ نے ان کی حکمت، دیانت اور معاملہ فہمی سے متاثر ہو کر انہیں اختیار دینے کی پیشکش کی۔ یوسف علیہ السلام نے خود یہ ذمہ داری سنبھالنے کی درخواست کی، اور اس کی دلیل میں دو صفات بیان کیں: "حفیظ" (امانت دار) اور "علیم" (علم و فہم والا)۔ یہ اعلان نہ غرور ہے، نہ خود ستائی، بلکہ ایک ذمہ دار انسان کی طرف سے قوم کی بہتری کے لیے اپنی صلاحیت پیش کرنے کا بہترین نمونہ ہے۔ یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ آنے والے سات قحط سالوں میں اگر انتظام درست نہ ہوا تو عوام بھوک، افلاس اور فساد کا شکار ہو جائے گی۔ ایسے نازک حالات میں صرف دیانتدار اور تجربہ کار قیادت ہی قوم کو بحران سے نکال سکتی تھی۔

یہ رویہ معاشرتی اور حکومتی نظام میں میرٹ، اہلیت، دیانت، اور امانت کی بنیاد رکھنے کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں قیادت یا کوئی ذمہ داری لینا، شہرت یا ذاتی مفاد کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کی رضا اور مخلوق کی خدمت کے لیے ہونا چاہیے۔ حضرت یوسفؑ نے یہ ذمہ داری صرف اس لیے لی کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کام کے لیے موزوں ترین شخص ہیں، اور یہ منصب کسی فاسد یا نااہل فرد کے پاس جانے سے روکنا بھی ان پر اخلاقی فرض تھا۔

یہ آیت موجودہ دور کے حکومتی، سیاسی، اور معاشرتی نظام کے لیے ایک زبردست رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ بدقسمتی سے آج کئی ادارے اقربا پروری، کرپشن، نااہلی، اور عدم شفافیت کا شکار ہیں۔ ان حالات میں قرآن کی یہ تعلیم ہمیں متوجہ کرتی ہے کہ ہر ذمہ داری صرف اس شخص کو دی جائے جو امین اور ماہر ہو۔ دیانت اور قابلیت قیادت کے دو بنیادی ستون ہیں جن کے بغیر کوئی بھی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔

---

[1] تبیان القرآن، ج ۲، ص ۲۱۴

[2] یوسف ۱۲:۵۵

یہ آیت ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ اگر کسی کے اندر صلاحیت ہو تو اسے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ اکثر صالح اور دیانتدار لوگ خود کو پردے میں رکھتے ہیں، اور یوں میدان فاسد لوگوں کے لیے خالی ہو جاتا ہے۔ یوسفؑ کا عمل بتاتا ہے کہ اہل شخص کا خود کو آگے لانا اور منصب کے لیے پیش ہونا خدمت اور اخلاص کے دائرے میں آتا ہے، بشرطیکہ نیت درست ہو اور مقصد صرف بہتری ہو۔ حضرت یوسفؑ کی یہ درخواست ہمیں بتاتی ہے کہ قیادت کی بنیاد صرف نسب، شہرت، یا طاقت نہیں ہونی چاہیے بلکہ امانت اور علم ہونی چاہیے۔ جب قیادت دیانتدار اور فہم و فراست رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں ہو، تو نہ صرف قوم ترقی کرتی ہے بلکہ اخلاقی قدریں بھی پروان چڑھتی ہیں، اور معاشرہ امن و سکون کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

سورہ یوسف قرآن مجید کی وہ عظیم سورہ ہے جسے خود رب تعالیٰ نے "احسن القصص" قرار دیا ہے، اور اس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو سے متعلق بصیرت و حکمت کا خزانہ موجود ہے۔ اس سورہ میں جہاں توحید، صبر، اور توکل جیسے عقائدی موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہیں اجتماعی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل اور ان کے اثرات کو بھی نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سورہ یوسف کی تعلیمات فرد اور معاشرہ دونوں کی اصلاح کے لیے راہنما ہیں۔

اجتماعی مسائل میں سب سے نمایاں پہلو حسد ہے، جو یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی جانب سے سامنے آیا۔ آیت 8 میں بیان ہوتا ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ﴾[1]

اس آیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب خاندانی نظام میں برابری اور انصاف کا فقدان محسوس ہو، تو اس کا نتیجہ حسد، نفرت، اور سازش کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ خاندانی نظام کو بچانے کے لیے عدل، حسنِ سلوک، اور محبت کا توازن قائم رکھنا ضروری ہے، ورنہ معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یوسف کے بھائیوں نے آپس میں اتحاد کو بدگمانی، مقابلہ اور بغض میں بدل دیا، جس کا نتیجہ ایک فرد کی زندگی اور پورے خاندان کے امن پر منفی اثرات کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اسی طرح ایک اور معاشرتی مسئلہ جھوٹ، دھوکہ اور الزام تراشی ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے قمیص پر جھوٹا خون لگا کر اپنے والد کو دھوکہ دیا (آیات 16-18)۔ اس جھوٹ نے خاندانی اعتماد کو توڑ دیا اور باپ کی زندگی کو غم کے اندھیروں میں دھکیل دیا۔ معارف القرآن اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جھوٹ اور فریب کی بنیاد پر بننے والے بیانیے وقتی طور پر فائدہ دے سکتے ہیں، لیکن وہ انجام کار اعتماد، سچائی، اور تعلقات کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا المیہ بن چکا ہے کہ لوگ مفادات کے لیے جھوٹ کو معمول بنا لیتے ہیں، جس سے نہ صرف خاندانی بگاڑ جنم لیتا ہے بلکہ پورا سماج فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔

اخلاقی مسائل میں سب سے اعلیٰ مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا عفو و درگزر کا رویہ ہے۔ جب بھائیوں نے برسوں بعد اپنی خطا کا اعتراف کیا، تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا:

﴿لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾[2]

---

[1] یوسف ۱۲:۵۵

[2] یوسف ۱۲:۹۲

"آج تم پر کوئی ملامت نہیں"۔

یہ رویہ دشمنی کو محبت میں، اور فاصلے کو قربت میں بدلنے کا ذریعہ بنا۔ معارف القرآن یہاں یہ نکتہ پیش کرتا ہے کہ عفو و درگزر انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی اصلاحِ معاشرہ کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر معاشرے کے افراد غلطیوں پر معافی دینے، صبر کرنے اور احسان کا مظاہرہ کرنے لگیں تو جھگڑے، فسادات، اور انتقامی جذبے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ اسی طرح صبر اور تقویٰ کا امتزاج بھی معاشرتی تعمیر کا اہم ستون ہے، جیسا کہ آیت 90 میں فرمایا: یعنی جو تقویٰ اور صبر اختیار کرتا ہے، اللہ اس کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ حضرت یوسفؑ نے اس اصول کو عملاً اختیار کیا، چاہے وہ قید خانہ ہو یا عزیز مصر کا محل۔ انہوں نے نہ صرف اپنی عزت کی حفاظت کی بلکہ اس صبر کے نتیجے میں قوم کی نجات اور معاشی بحران سے نمٹنے کی تدابیر بھی پیش کیں۔

معارف القرآن

اس آیت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ افراد اگر اخلاقی اصولوں پر قائم رہیں تو وہ نہ صرف اپنی ذات کی حفاظت کرتے ہیں بلکہ اجتماعی طور پر پورے معاشرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ آخر میں سورہ یوسف کا وہ پہلو نہایت اہم ہے جہاں یوسف علیہ السلام کو مالی و سیاسی بحران کے دوران تدبیر کا موقع ملا (آیت 47)۔ انہوں نے قوم کو سات سالہ قحط سے نکالنے کے لیے نہایت ذہانت، تقویٰ اور عدل سے کام لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی قیادت کے لیے اخلاقی استقامت، علم، اور فہم ضروری ہیں۔ اگر قیادت درست ہاتھوں میں ہو تو قوم بحران سے نکل کر فلاح کی جانب گامزن ہو سکتی ہے۔[1]

سورہ یوسف نہ صرف ایک تاریخی واقعہ ہے بلکہ معاشرتی اور اخلاقی تعلیمات کا ایک مکمل نظام بھی ہے۔ اس سورہ میں کئی ایسے اجتماعی مسائل بیان ہوئے ہیں جن کا تعلق خاندانی تعلقات، عدل و انصاف، جھوٹ، حسد، معافی، کردار سازی، اور قیادت سے ہے۔ تبیان القرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حیات طیبہ کو انسانی معاشرے کی اصلاح کے لیے نمونہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس میں موجود اخلاقی اصول ہر دور کے انسان کے لیے قابلِ عمل ہیں۔

سب سے پہلا معاشرتی مسئلہ خاندانی حسد ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے خلاف سازش کی، کیونکہ وہ ان کے والد کو زیادہ محبوب تھے۔

ضیاء القرآن

سورہ یوسف، ضیاء القرآن کی روشنی میں ایک مثالی اخلاقی و معاشرتی دستور پیش کرتی ہے جس میں خاندانی حسد، جھوٹ، دھوکہ دہی، الزام تراشی، ناانصافی، اور قیادت کی کوتاہی جیسے اہم اجتماعی و اخلاقی مسائل نمایاں کیے گئے ہیں۔ ان کے نقصانات نہ صرف افراد پر ہوتے ہیں بلکہ پورا معاشرہ ان سے متاثر ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی سازش نے خاندانی تعلقات کو توڑا، جھوٹ نے باپ کو برسوں غم میں مبتلا

[1] معارف القرآن، ج۴، سورۃ یوسف کی تفسیر، مفتی محمد شفیع عثمانیؒ، ادارہ معارف القرآن، کراچی۔

کیا، اور کردار کشی نے معاشرے میں بدگمانی کو فروغ دیا۔ عدالتی نظام کی کمزوری حضرت یوسفؑ جیسے پاکباز انسان کو جیل پہنچا گئی۔ تاہم، انہی حالات میں حضرت یوسفؑ کا صبر، تقویٰ، معافی اور دور اندیشی پر مبنی قیادت اس بات کا درس دیتی ہے کہ انفرادی کردار اور اخلاقی استقامت سے اجتماعی بگاڑ کو اصلاح میں بدلا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید یہاں ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ معاشرتی مسائل کے باوجود اگر قیادت، عفو، صبر، اور تقویٰ جیسے اصول اپنائے جائیں تو معاشرہ ترقی اور سکون کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔

مزید برآں، سوسائٹی میں کردار کشی اور الزام تراشی کا مسئلہ سامنے آتا ہے، زلیخا کے عشق کا چرچا کرنے والی خواتین دراصل معاشرتی بدگمانی، چغلی اور کردار کشی کو فروغ دے رہی تھیں۔ ضیاء القرآن میں لکھا گیا ہے کہ جب معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار ہو جائے تو افراد کی عزتیں محفوظ نہیں رہتیں، اور اس طرزِ عمل سے معاشرتی اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو بے گناہی کے باوجود جیل میں ڈال دیا جانا ایک اور بڑا مسئلہ ہے یہ عدالت اور انصاف کے نظام پر سوالیہ نشان ہے۔ ضیاء القرآن کے مطابق، طاقتور افراد جب نظامِ عدل کو اپنے مفاد میں استعمال کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ معاشرتی ناانصافی اور محرومی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی جیل میں قید پوری سوسائٹی کی بے حسی کو ظاہر کرتی ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو ان کے سنگین جرائم کے باوجود معاف کر دیا۔ ضیاء القرآن میں لکھا ہے کہ یہ رویہ ایک مثالی معاشرے کی بنیاد ہے، جہاں معافی کو ذاتی وقار کی کمزوری نہیں بلکہ اخلاقی عظمت سمجھا جاتا ہے، اور یہی طرزِ عمل باہمی نفرت کو محبت میں بدلنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

قحط کے دور میں حضرت یوسفؑ کی معاشی تدبیر (یوسف:47) نے ریاست کو بحران سے نکالا۔ انہوں نے حکمت اور عقل مندی سے عوام کو محفوظ رکھا۔ ضیاء القرآن اس کو قیادت کا سنہرا اصول قرار دیتا ہے کہ قائد وہی ہوتا ہے جو عوام کی فلاح کے لیے دور اندیشی سے کام لے۔ حضرت یوسفؑ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ متقی اور صابر بندوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ ضیاء القرآن کے مطابق یہ پیغام ہر فرد کے لیے ہے کہ ظلم، فتنہ، اور آزمائش کے دور میں بھی صبر اور تقویٰ کو نہ چھوڑا جائے، یہی اخلاقی برتری ہے۔[1]

تبیان القرآن

تبیان القرآن میں لکھا ہے کہ جہاں والدین اپنی محبت میں انصاف نہیں کرتے یا اس کا اظہار متوازن انداز میں نہیں ہوتا، وہاں اولاد کے درمیان حسد جنم لیتا ہے، جو بعض اوقات ایسے سنگین جرم کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس سے پورا خاندانی نظام متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور بڑا اخلاقی بحران جھوٹ اور دھوکہ دہی کا ہے، جیسا کہ بھائیوں نے والد کو دھوکہ دیا: انہوں نے یوسفؑ کے خون آلود کپڑے کو جھوٹا ثبوت بنا کر پیش کیا۔

تبیان القرآن کے مطابق یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ جب انسان اپنے مقصد کے حصول کے لیے جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی کو جائز سمجھنے لگے، تو وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ یہ رویہ معاشرے میں اعتماد اور سچائی کی بنیادوں کو کمزور کرتا ہے اور اجتماعی اعتبار سے تباہ کن نتائج دیتا ہے۔ ایک اور اہم مسئلہ بے جا الزام تراشی اور بدنامی کا ہے، جیسا کہ یوسفؑ پر زلیخا کی طرف سے لگائے گئے الزامات اور پھر شہر کی عورتوں کی

[1] پیر کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، جلد:3، سورۃ یوسف کی تفسیر، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور۔

چغلیاں، یہ کردار کشی معاشرتی بگاڑ کا باعث بنی، اور اخلاقی پستی کو ظاہر کرتی ہے۔ تبیان القرآن اس مقام پر واضح کرتا ہے کہ جب معاشرے میں اخلاقیات کمزور پڑتی ہیں تو لوگوں کی عزتیں کھیل بن جاتی ہیں، اور یہ طرز عمل نہ صرف فرد بلکہ پوری سوسائٹی کے لیے فساد کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

عدل و انصاف کا فقدان بھی اس سورہ کا اہم معاشرتی موضوع ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو الزامات کے باوجود جیل میں ڈال دیا گیا یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ جب طاقتور طبقہ قانون کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے تو مظلوم انصاف سے محروم رہ جاتا ہے۔ تبیان القرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ رویہ معاشرے میں قانونی بداعتمادی کو جنم دیتا ہے اور عوام کا نظام عدل سے یقین اٹھنے لگتا ہے، جو بہت بڑا اجتماعی نقصان ہے۔ اس کے برعکس، حضرت یوسفؑ کا کردار عفو و درگزر کی عظیم مثال ہے انہوں نے اپنے بھائیوں کو ان کے جرم پر معاف کر دیا۔ تبیان القرآن اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ معاشرتی امن، محبت، اور بھائی چارے کا قیام تب ہی ممکن ہے جب افراد معافی اور درگزر کی روش اپنائیں۔ اگر ہر شخص اپنے بدلہ لینے پر اصرار کرے تو معاشرہ کبھی پر سکون نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی معاشی تدبیر (یوسف:47) معاشرتی بحرانوں میں قیادت کے کردار کو واضح کرتی ہے۔ انہوں نے سات سالہ قحط سے قوم کو محفوظ کیا۔ تبیان القرآن کے مطابق اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ، علم اور دانائی کی بنیاد پر تیار کی گئی پالیسی قوم کو بحران سے نکال سکتی ہے، جبکہ بدعنوان قیادت صرف مسائل کو بڑھاتی ہے۔

معاشرتی اخلاقیات کا نچوڑ ہے۔ تبیان القرآن کے مطابق اگر افراد تقویٰ اختیار کریں اور صبر کے ساتھ ظلم و آزمائش کا مقابلہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو بلند مقام عطا کرتا ہے۔ یہ اصول نہ صرف فرد کی اصلاح کرتا ہے بلکہ پورے معاشرے میں عدل، امن اور بہتری کی راہیں کھولتا ہے۔[1]

منتخب تفاسیر کی روشنی میں اجتماعی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کے اثرات

قرآن کریم میں انسانی معاشرت اور اخلاقی اقدار پر بارہا زور دیا گیا ہے، اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ فرد کی اصلاح اور معاشرتی نظم و استحکام ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ انسانی زندگی میں اخلاقی گراوٹ جیسے جھوٹ، فریب، ظلم، حسد، خود غرضی اور ناانصافی نہ صرف فرد کی روحانی تربیت کو متاثر کرتے ہیں بلکہ پورے معاشرے میں انتشار اور بے یقینی کا سبب بنتے ہیں۔ جب معاشرتی روابط کی بنیاد انصاف، امانت، اور احسان پر مضبوط نہ ہو، تو معاشرہ فرقہ وارانہ کشمکش، سماجی عدم مساوات اور اخلاقی پستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بارہا عدل و انصاف، احسان، صبر، شرافت، اور حقوق العباد کی پاسداری کو معاشرتی فلاح اور انسانی خوشحالی کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ یہ تعلیمات فرد کو ذاتی اصلاح اور اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور دیتی ہیں اور ساتھ ہی اسے معاشرتی فرائض کے لیے بھی تیار کرتی ہیں تاکہ ہر شخص اپنے حقوق اور فرائض کا ادراک رکھتے ہوئے ایک متوازن اور پُرامن معاشرہ تشکیل دے۔ اخلاقی اصولوں کی پابندی، جیسے امانتداری، سچائی، اور انصاف پسندی، فرد کے لیے روحانی سکون اور معاشرے کے لیے اجتماعی ہم آہنگی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر معاشرے میں یہ اصول کمزور ہو جائیں، تو سماجی روابط

[1] غلام رسول سعیدی، تبیان القرآن، جلد:۳، سورۃ یوسف کی تفسیر، مکتبہ نعیمیہ لاہور۔

میں دراڑیں پیدا ہوتی ہیں، استحکام ختم ہوتا ہے، اور ظلم و فساد کے واقعات بڑھ جاتے ہیں، جس کے اثرات معیشت، سیاست اور ثقافتی اقدار پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔

معارف القرآن میں اس پہلو پر خصوصی توجہ دی گئی ہے کہ انسانی اخلاق اور اجتماعی عدل ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں؛ اگر فرد کی اصلاح نہ ہو تو معاشرتی نظام غیر مستحکم ہو جاتا ہے اور اجتماعی فلاح متاثر ہوتی ہے۔ ضیاء القرآن میں مزید وضاحت کی گئی ہے کہ اخلاقی گراوٹ، جیسے حسد، ظلم، اور جھوٹ، صرف فرد کی روحانی کمزوری نہیں بلکہ یہ معاشرتی استحکام کے لیے خطرہ ہیں، کیونکہ یہ انسانوں کے باہمی تعلقات کو نقصان پہنچاتے ہیں، اعتماد کو ختم کرتے ہیں، اور معاشرتی انصاف کو متاثر کرتے ہیں۔ تبیان القرآن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ قرآن کی ہدایات نہ صرف اخلاقی اصولوں کی پابندی کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہیں بلکہ یہ معاشرتی ڈھانچے کو مستحکم بنانے اور لوگوں کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنے کا بھی ذریعہ ہیں۔ قرآن میں صبر، شرافت، اور حقوق العباد کی پاسداری کی تعلیمات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے توازن قائم کرنا ضروری ہے۔ اجتماعی سطح پر یہ اصول معاشرتی تعلقات کو مضبوط بناتے ہیں، عدل و انصاف کو فروغ دیتے ہیں، اور ایک ایسے ماحول کو یقینی بناتے ہیں جہاں انسانی وقار، بھائی چارہ اور سماجی سکون برقرار رہے۔ مجموعی طور پر، منتخب تفاسیر کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاقی اصولوں کی پابندی صرف ذاتی فلاح کا ذریعہ نہیں بلکہ معاشرتی استحکام، اجتماعی ہم آہنگی، اور انسانی خوشحالی کے لیے بھی لازمی ہے، اور قرآن کریم کی رہنمائی کے بغیر یہ ممکن نہیں۔

خلاصہ بحث

اس فصل میں قرآن کریم کی روشنی میں معاشرتی اور اخلاقی مسائل کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس میں واضح کیا گیا کہ فرد کی اخلاقی اصلاح اور معاشرتی استحکام ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔ قرآن کی تعلیمات کے مطابق جھوٹ، ظلم، حسد اور خود غرضی جیسی برائیاں نہ صرف انسان کی روحانی تربیت کو متاثر کرتی ہیں بلکہ پورے معاشرے میں انتشار، ناانصافی اور بے یقینی پیدا کرتی ہیں۔ اخلاقی اصولوں کی پاسداری جیسے عدل، امانت، احسان اور صبر، فرد کو ذاتی سکون عطا کرتی ہیں اور معاشرتی ہم آہنگی قائم کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ معارف القرآن، ضیاء القرآن اور تبیان القرآن کی روشنی میں یہ واضح ہوا کہ اخلاقی گراوٹ کے اثرات صرف ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر بھی مرتب ہوتے ہیں، اور قرآن کی ہدایات فرد اور معاشرہ دونوں کی اصلاح و فلاح کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر، یہ فصل اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ قرآن کریم کے اخلاقی اصول فرد کی فلاح اور معاشرتی استحکام دونوں کے لیے لازمی ہیں، اور ان کی عملی پیروی کے بغیر معاشرتی سکون اور انصاف ممکن نہیں۔

نتائج البحث

1. سورہ یوسف فرد کی اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ معاشرتی ہم آہنگی اور عدل پر مبنی نظام کی تشکیل کی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

2. حسد، جھوٹ، اور دھوکہ جیسے انفرادی گناہ خاندان اور معاشرے میں انتشار اور ناانصافی کو جنم دیتے ہیں۔

3. صبر، امانت، عدل اور حکمت جیسے اخلاقی اوصاف معاشرتی فلاح، استحکام اور باہمی اعتماد کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

4. خوابوں کی تعبیر جیسے روحانی پہلو بھی سماجی و اقتصادی فیصلوں میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

5. حضرت یوسفؑ کی زندگی اس بات کا عملی نمونہ ہے کہ حکمت و تدبیر سے بحرانوں کا حل اور انصاف پر مبنی معاشرہ ممکن ہے۔

6. قرآن کی تعلیمات ہر دور میں فرد و معاشرے کو درپیش اخلاقی و سماجی مسائل کے حل کے لیے آفاقی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔

سفارشات

1. اخلاقی تربیت کو ترجیح دی جائے: خاندان، سکول اور معاشرتی ادارے نوجوانوں میں صبر، امانت، عدل اور قربانی جیسے اخلاقی اصولوں کی تربیت دیں تاکہ فرد اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی میں اخلاقی اصولوں پر عمل کر سکے۔
2. اجتماعی ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے: معاشرتی پروگرامز اور سرگرمیوں کے ذریعے تعاون، ہمدردی اور بھائی چارے کے جذبات کو مضبوط کیا جائے تاکہ سماجی ہم آہنگی قائم رہے۔
3. ذاتی برائی کے اثرات کم کیے جائیں: فرد کی ذاتی برائی اور حسد، جھوٹ، دھوکہ وغیرہ کے اثرات کو کم کرنے کے لیے تربیتی اور اصلاحی پروگرامز مرتب کیے جائیں۔
4. معاشرتی انصاف اور اقتصادی شفافیت کو فروغ دیا جائے۔
5. معاشرتی اور اقتصادی منصوبہ بندی میں عدل اور شفافیت کی عملی تربیت ہو تاکہ افراد کی ذاتی غلطیاں معاشرتی انتشار میں تبدیل نہ ہوں۔
6. قرانی تعلیمات کو معاشرتی عمل میں نافذ کیا جائے۔
7. سورہ یوسف کی تعلیمات کے مطابق معاشرتی اور اخلاقی مسائل کے حل میں قران کی رہنمائی کو ترجیح دی جائے تاکہ معاشرتی تعلقات مضبوط اور اخلاقی اقدار قائم رہے۔

نمبر شمار	قرآنی آیات	سورہ و آیت نمبر	صفحہ نمبر
1.	ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ	الفاتحہ 1:2	30
2.	مَٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ	الفاتحہ 1:3	30
3.	إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ	الفاتحہ 1:4	30
4.	صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ	الفاتحہ 1:6	31
5.	أَلَمۡ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَهُمۡ أُلُوفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ	البقرۃ 2:243	13
6.	يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُ	البقرۃ 2:282	32,33
7.	إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ	البقرۃ 2:153	52
8.	وَلَا تَهِنُواْ وَلَا تَحۡزَنُواْ	آل عمران 3:139	46
9.	يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱصۡبِرُواْ	آل عمران 3:200	45
10.	يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُواْ رَبَّكُمُ	النساء 4:1	09
11.	أَلَمۡ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم	النساء 4:49	102
12.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ	المائدہ 5:2	14
13.	قُلۡ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيۡكُمۡ جَمِيعاً	الاعراف 7:158	13
14.	قُل لَّآ أَمۡلِكُ لِنَفۡسِي	الاعراف 7:188	60
15.	يَآ اَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا اِذَا لَقِيۡتُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا زَحۡفًا	الانفال 8:15	46
16.	يَآ اَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ	التوبہ 9:119	101
17.	إِذۡ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ	یوسف 12:4	85،88
18.	قَالَ يٰبُنَىَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡيَاكَ عَلٰٓى اِخۡوَتِكَ فَيَكِيۡدُوۡا لَكَ كَيۡدًا	یوسف 12:5	94
19.	وَكَذَٰلِكَ يَجۡتَبِيكَ رَبُّكَ	یوسف 12:6	82،89
20.	إِذۡ قَالُواْ لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ	یوسف 12:8	3107,11
21.	ٱقۡتُلُواْ يُوسُفَ أَوِ ٱطۡرَحُوهُ	یوسف 12:9	108,129
22.	وَجَآءُو عَلَىٰ قَمِيصِهِ	یوسف 12:18	46,109
23.	وَقَالَ الَّذِى اشۡتَرٰىهُ مِنۡ مِّصۡرَ لِامۡرَاَتِهٖۤ	یوسف 12:21	82
24.	وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا	یوسف 12:22	58،60
25.	وَرَاوَدَتۡهُ الَّتِىۡ هُوَ فِىۡ بَيۡتِهَا عَنۡ نَّفۡسِهٖ	یوسف 12:23	110
26.	قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَىَّ مِمَّا يَدۡعُوۡنَنِىۡۤ اِلَيۡهِ	یوسف 12:33	75،77
27.	فَٱسۡتَجَابَ لَهُۥ رَبُّهُۥ	یوسف 12:34	76،77

28.	ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيَاتِ	یوسف12:35	79,134
29.	وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْٓ اَرٰی سَبْعَ بَقَرَاتٍ	یوسف12:43	96،100
30.	قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا	یوسف12:47	103
31.	قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ	یوسف12:55	117,141
32.	قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰی تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ	یوسف12:66	67
33.	وَقَالَ يٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ	یوسف12:67	68
34.	وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ	یوسف12:68	68
35.	قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا	یوسف12:83	48
36.	قَالُوْٓا أَإِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ	یوسف12:90	49
37.	قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ	یوسف12:92	119,120
38.	وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا	یوسف12:100	115
39.	رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ	یوسف12:101	82
40.	ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ	یوسف12:102	60
41.	وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ	النحل 16:43	63
42.	وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ	الکہف18:28	43
43.	وَٱذْكُرْ فِي ٱلْكِتَٰبِ إِبْرَٰهِيمَ	مریم19:41	103
44.	وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ	الانبیاء21:83	44
45.	وَمَآ اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ	الانبیاء21:107	13
46.	وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا	الفرقان25:54	11
47.	قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ	النمل27:65	60
48.	وَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا كَآفَّةً	سبا34:28	13
49.	وَٱلَّذِي جَآءَ بِٱلصِّدْقِ	الزمر39:33	103
50.	فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ	الاحقاف46:35	46
51.	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ	محمد47:33	46
52.	لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ	الفتح48:27	92
53.	فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی	النجم53:32	49
54.	يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا	التحریم66:8	75،76
55.	وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ	الفلق113:5	109

نمبر شمار	احادیث	کتاب/حدیث نمبر	صفحہ نمبر
1	الشرک باللہ والسحر وقتل النفس	صحیح بخاری، حدیث: ۱۹۸/۳	13
2	الا کلکم راع وکلکم مسئول	صحیح بخاری، حدیث: ۷۱۳۸	14
3	اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللہِ التَّامَۃِ	صحیح بخاری، حدیث: ۳۳۷۱	71
4	الْعَیْنُ حَقٌّ	صحیح بخاری، حدیث: ۵۷۴۰	71
5	أَمَرَنِي رَسولُ اللہِ صَلَّی اللہُ علیہ وسلَّمَ	صحیح بخاری، حدیث: ۵۷۳۸	71
6	من رآني في المنام فسيراني	صحیح بخاری، حدیث: ۶۹۹۳	93
7	بينا انا نائم اتيت	صحیح بخاری، حدیث: ۷۰۰۷	93
8	لا تزال طائفة من امتي	صحیح مسلم، حدیث: ۳۹۵	30
9	فقيه اَشد على الشيطان	جامع ترمذی، حدیث: ۲۶۸۱	57
10	بينما انا نائم إذ اتيت بقدح لبن	جامع ترمذی، حدیث: ۲۲۸۴	93

مصادر و مراجع

1. ابن ابی حاتم الرازی، تفسیر ابن ابی حاتم، مکتبۃ نزار مصطفی الباز، مکہ مکرمہ، ۱۹۹۷
2. ابن الجوزی، زاد المسیر فی علم التفسیر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۷

3. ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، دارالسلام، ریاض ۱۴۱۷
4. ابو داؤد، ابو داؤد کتاب الادب، باب فی الظن، دارالسلام، ریاض، ۱۴۲۰ھ
5. ارمغان حجاز از علامہ اقبال، ناشر: شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۴۸ء
6. امام ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، دار المعارف، بیروت، ۲۰۱۳
7. امام بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، دارالسلام، ریاض، ۱۴۱۷ھ۔
8. امام بیہقی، السنن الکبریٰ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۴
9. امام ترمذی، سنن ترمذی، صفت القیامہ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۴ھ
10. امام طبری، جامع البیان عن تأویل آی القرآن، دارالمعرفۃ، بیروت، ۱۴۰۹
11. إمام محمد الرازي فخر الدين بن ضياء الدين، تفسیر کبیر، دار الفکر، ۱۹۸۱
12. بدرالدین العینی، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۱
13. پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۰
14. حافظ احمد بخش، جمال کرم، ضیاء القرآن پبلیشرز، لاہور، ۲۰۱۱
15. حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، اکابر علمائے دیوبند، ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۹۹
16. حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، پچاس جلیل القدر علما، المیزان اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۶ء
17. حافظ محمد اکبر شاہ بخاری، بیس علمائے حق، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۵
18. حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی، معاشرتی بگاڑ کا سدباب، مکتبہ لدھیانوی، کراچی، ۱۹۹۵
19. خالد علوی، اسلام کا معاشرتی نظام، الفاروق بک فاونڈیشن، لاہور، ۱۹۹۷ء
20. ڈاکٹر عاطف اسلام راؤ، علامہ غلام رسول سعیدی کی علمی خدمات، مجلہ الثقافۃ الاسلامیہ، ۲۰۱۸
21. راغب اصفہانی، مفردات القرآن، المکتبۃ القاسمیہ، لاہور، ۱۹۶۳
22. ربیعہ ریاض، تفسیر فتح المنان اور تفسیر تبیان القرآن میں مباحث علوم القرآن کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم فل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
23. رشید احمد جالندھری، قرآن مجید اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ، جامعہ بلوچستان، کوئٹہ، ۱۹۸۰ء
24. سیدہ بشریٰ تابش، تعلیمات نبوی ﷺ اور ہماری زندگی، مکتبہ دارالبلاغ، لاہور، ۲۰۱۲ء
25. شرح صحیح مسلم، فرید بک سٹال، اردو بازار لاہور
26. شرح مشکوۃ المصالح، دار الاشاعت کراچی ۱۹۹۴ء
27. ضیائے حرم، لاہور، شمارہ اپریل ۲۰۰۲

28. عبد الرحمن ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون, کوا پریٹو اسٹیم پریس، ۱۹۲۴ء

29. علی متقی الہندی، کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۸۵

30. الغزالی، امام ابو حامد۔ احیاء علوم الدین، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۹،

31. فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر (مفاتیح الغیب)، دار الفکر، بیروت، ۱۹۸۱

32. قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز ادارہ ضیاء المصنفین، بھیرہ شریف

33. قاضی سلیمان منصور پوری، الکمال الجمال، مکتبہ اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۹

34. القرطبی، ابو عبد اللہؒ، الجامع لأحکام القرآن الشھیر بتفسیر القرطبی، دار الکتب المصریۃ، قاہرہ، ۱۹۶۷

35. محمد بن سیرین، تعبیر رویا، زاویہ پبلشر، لاہور، ۲۰۰۱

36. محمد تقی عثمانی، علوم القرآن، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۱۵ء

37. محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء

38. محمد قطب، اسلام کا نظام تربیت، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

39. محمد ناصر الدین الالبانی، صحیح الجامع الصغیر وزیادتہ، المکتبہ الاسلامی بیروت، ۱۹۸۸

40. مفتی تقی عثمانی، میرے والد میرے شیخ اور ان کا مزاج ومذاق، ادار والمعارف، کراچی، ۱۹۹۴ء

41. مفتی محمد شفیع، کشکول، دار الاشاعت، کراچی ۱۹۶۳ء

42. مفتی محمد شفیع عثمانی، مقدمہ معارف القرآن، ادار والمعارف کراچی، ۲۰۰۸

43. مودودی، سید ابو الاعلی تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور ۱۹۸۰

44. مولانا سمیع الحق، اسلام اور عصر حاضر، موتمر المصنفین، پشاور، ۱۹۷۴ء

45. مولانا گوہر رحمن، علوم القرآن، مکتبہ تفہیم القرآن مردان، ۲۰۱۲

46. مولانا محمد ناصر خان چشتی، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۹۹ء

47. نظام الدین نشاپوری، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۱